U32259

title - Khamkhana-E-Kaifi

Creator - Brij Mohan wa Tatariye, Kaifi ; Mohd. Umar-O-Noor Ilahi.

Publisher - Lahore Printing Press (Lahore)

Date - 1924

Pages - 67

Subject - Urdu Shayari - Majmua Kalaam

خمخانۂ کیفی

یعنی

ادیب بے مثال و شاعر باکمال جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ
صاحب کیفی دہلوی اسسٹنٹ فارن سیکرٹری ریاست جموں و کشمیر
کی چند دلاویز نظموں کا مجموعہ

معہ دیباچہ از اثر قلم

عالیجناب خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب متخلص ناظر ممبر سٹیٹ کونسل
ریاست جموں و کشمیر

مرتبہ
محمد عمر و نور الٰہی
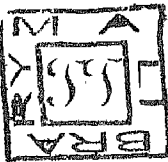
سنہ ۱۹۲۴ء

لاہور پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام منشی رحیم بخش چھپا

بار اول

قیمت ۶ر

تفصیل مطالب

دیباچہ

از

عالیجناب خان بہادر چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر بی اے - ممبر
کونسل عالیہ ریاست جموں و کشمیر

پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ المتخلص بہ کیفی کہنہ مشق شاعر ہیں - اور کسی
تعارف کے محتاج نہیں - مخزن کا ابتدائی دور آپ کے کیفِ سخن سے
فیضیاب رہا - اور اردو کے دیگر رسالے بھی آپ کے لطفِ کلام سے بہرہ اندوز
ہوتے رہے ہیں - ان پانچوں نظموں کا جداگانہ ریویو کرنا غیر ضروری معلوم
ہوتا ہے - کیونکہ جناب کیفی کا عارفانہ اور محققانہ رنگ اُن کی سب نظموں
میں یکساں پایا جاتا ہے میں اُن کے طرزِ بیان اور تخیل کا دل سے مداح
ہوں - مگر اِس مختصر نوٹ میں اُن کے کلام کی مدحت سرائی میرا مقصود نہیں
بلکہ اُن کے اندازِ بیان اور طرزِ خیال میں بعض امتیازی اوصاف ہیں -
جن کا اظہار ایسے ریویو میں مناسب معلوم ہوتا ہے - اوّل یہ کہ آپ کا
کلام لفظی و معنوی ہر دو اعتبار سے جزل ہے اور "ولی را ولی می شناسد"
ایسی خصوصیت کی وجہ سے میں اُنکی شاعری کو خاص عزت کی نگاہ سے

دیکھتا ہوں۔ نیچرل شاعری کا دائرہ عام طور پر بہت محدود خیال کیا جاتا ہے اور اس کو قومی نظموں اور قدرتی مناظر کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور ایک خاص امتیاز نیچرل شاعری کا یہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ کہ "دندان تو جملہ در دہانند" کی مصداق ہو۔ مگر در اصل یہ معیار غلط اور محض غلط ہے۔ شاعری بظاہر اس مادہ پرست زمانہ میں ایک بیکار چیز ہے۔ لیکن اس کی وسعت زمین و آسمان اور ما فیہا و ما فوقہا پر حاوی ہے۔ اور نیچرل شاعری کا خاص امتیاز صرف اس قدر ہے۔ کہ طرز بیان اور طرز خیال میں اس قدر تکلف اور غلو نہ کیا جائے۔ کہ اصلیت سے بالکل معرا ہو جائے۔ ورنہ ندرت خیال۔ رنگینی ادا لطافت تشبیہ و نزاکت استعارہ وغیرہ نیچرل شاعری کے منافی نہیں۔ اب حضرت کیفی کی نیچرل شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں کوئی بیکار لفظ محض برائے وزن بیت استعمال نہیں کیا گیا۔ اور کوئی مضمون بے معنی اور بے مصرف تخیل پر مبنی نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

"ترانۂ حقیقت"

سویدائے دل حسن آفریں ہم اسکو سمجھے ہیں ۔۔۔ جسے تو خال رخسار بتاں کا دانہ سمجھا ہے
شمۂ گل نخستینا گلبن ہے اثر اس سے ملتا ہے ۔۔۔ تو جس سبزے کو اس گلزار میں بیگانہ سمجھا ہے

"باغ دل"

پہناؤں گردن سرو بھی میں طوق قمری کا ۔۔۔ دہن میں غنچے کے پیدا عنادل کی زباں کر دوں
سمن کے سینۂ صافی میں ڈالوں داغ لالہ کا ۔۔۔ رگ گل سے مرتب بلبلوں کا آشیاں کر دوں

بھروں وہ حسن شام کی مرلی کی کوئل کے ترنم میں — جبینانِ چمن کو بیخودی میں گیت بیاں کردوں

"فلسفہ ہمہ اوست" عارفانہ مذاق کے شعر کے لئے خاص دلفریبی اور کشش رکھتا ہے۔ اور کیفی صاحب نے اس مضمون کو مختلف دلکش پیرایوں میں ادا کیا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور یہی چند جام کیفی اہلِ ذوق کو مست و سرشار کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

دوسری خصوصیت حضرت کیفی کے کلام کی یہ ہے۔ کہ آپ کا معیارِ تخیل بہت بلند ہے اور رنگینی چوکھی۔ اور کمر و دہن کے فرسودہ۔ پامال اور عامیانہ مضامین سے شعر و قصائد کے ناپاک دفتر میں اضافہ نہیں کرتے۔ درحقیقت بلند پایہ شاعر ہمائے اوجِ حقیقت ہے۔ کہ اس عالمِ سفلی کے رہنے والوں کو عالمِ بالا کی سیر کراتا ہے۔ اور ان مادی اجسام کی سوتی روحوں کو بیدار کرتا رہتا ہے۔

ع ہے کمالِ اہلِ سخن یہی کہ وہ حسن کا جلوہ نما رہے

آپ کے عشقِ حقیقی کا معیار حرص و ہوا سے معرا اور دیر و کنشت سے ماورا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

"عشق"

پھر کہاں تم اور کہاں دیر و حرم کے سنگ و خشت — دل میں جب عشقِ حقیقی جلوہ آرا ہو گیا

گھاٹ اس تلوار کے اترا جو عاشق تر گیا — دھار تیغِ عشق کی گنگا کا دھارا ہو گیا

اور گہرا غوطہ ملاحظہ فرمائیے۔

قعر میں بحرِ محبت کے ہوا جو تہ نشیں — ساحلِ امید سے اس کو کنارا ہو گیا

بیم اور اُمید کی باقی نہیں رہتی لگن — جس کے دل میں عشق کا روشن شرارا ہو گیا
تخت پر عشقِ حقیقی کے ہُوا جو جلوہ گر — اُس کے سایہ سے جہاں پر نُور سارا ہو گیا

حضرت کیفی کا دائرہ عشق وسیع ہے اور اقوام و ملل کے حدود اسکے لیئے مانع نہیں۔ وُہ کثرت میں وحدانیت کا تماشا کرتے ہیں۔ اور وحدت قیدِ دیر و حرم سے آزاد ہے۔ کیا خوب کہا ہے

"عشق"

سویدائے دل اپنا ہے وُہ مرکز جذبِ اُلفت کا — بلائیں رات دن لیتا ہے مہر آسماں میری
دلِ عشق آشنا کو ہیں حرم اور بتکدہ یکساں — زبس ششدر ہے یکرنگی سے نیرنگِ زباں میری
عشقِ خالص ہو گیا ہو جسکے دلمیں جلوہ گر — امتیاز اس کے لیے شیخ و برہمن میں نہیں
دیر و کعبہ کیا ہے ہر ذرہ میں عکسِ روئے دوست — فرق چشمِ عشق میں مسکن سے مسکن میں نہیں

اشعارِ ذیل کو رسمی نقلی کا نمونہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ طورِ وحدت کے شعلے ہیں جو حرارتِ عشق سے جلوہ گر ہو رہے ہیں ؎

نظر بیباندہ آتا ہوں اگرچہ گرد کی صورت — دلِ جویا کو آوازِ درائے کاروان ہُوں میں
نہاں ہُوں گر تو یُوں جیسے کہ بُوئے پیرہن پنہاں — عیاں ہوں تو شرارِ طُور کی صورت عیاں ہُوں میں

ارواح و اجسام کا دورِ تسلسل اور موت و حیات کا تواتر ہمیشہ سے مطمح النظر شعراء کے تخیل کی جولانگاہ رہا ہے۔ مولانا رُومؒ فرما گئے ہیں۔

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

کیفی صاحب نے بھی اس بحرِ ذخار میں غوطے لگائے ہیں۔

نہ سمجھے وہ حقیقت زندگی اور موت کی اب تک — اجل کو جو طبیب اور موت کو دکھ کی دوا سمجھے

پڑیگا تم کو یہ بھگتان مر کے بھی بھگتنا — یہ دو گھڑی ہے بلا میعاد تم اسکو ہو کیا سمجھے

کیفی صاحب کا طرۂ امتیاز اُن کا شاعرانہ فلسفہ یا فلسفیانہ شاعری ہے۔ اور اُن کے خمخانہ وحدت میں عقائد کی بحث بے محل ہوگی۔ ورنہ وہی مثل صادق آئیگی۔ کہ شعر مرا بہ مکتب کہ برد۔

کیفی صاحب کے چار ترکیب بند۔ ترانۂ حقیقت۔ باغِ دلِ عشق۔ اور مخدوم کی بزم چہار جام وحدت ہیں۔ اور ان سب کا موضوع درحقیقت ایک ہی ہے۔ مگر پانچواں ترکیب بند خیر مقدم گرامی۔ ان کے اور بندۂ ناظر کے ایک قدیمی اور محبوب و مکرم دوست حضرت گرامی کی شان میں لکھا گیا ہے۔ اور جذب الفت کی وجہ سے کلام میں خوب گرمی اور حلاوت پیدا ہوگئی ہے۔ حضرت گرامی اس قابل ہیں۔ کہ چاردانگ ہند میں ان کے خیر مقدم لکھے جائیں۔ قند پارس اکثر اردو جرائد کی دوکانوں میں بکتی ہے۔ مگر اہلِ مذاق جانتے ہیں۔ کہ اس کا مزہ عموماً پھیکا ہوتا ہے۔ اور قند پارس تو کجا پشاور کے گڑ کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت گرامی کا دم غنیمت ہے کہ اُن کے کلام میں ابتک صہبائے شیراز و گلگشت مصلا کی بوباس پائی جاتی ہے۔ اور اُن کے نوہائے عارفانہ و سرود مستانہ سے طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔ یہ نظم خوب دلچسپ اور دلگداز ہے اور جناب کیفی نے بھی اس بات کا احساس کیا ہے۔ کہ اب یہ خمخانہ خالی ہو رہا ہے۔ اور

گرامی کے بعد اس وسیع ملک ہندوستان میں کوئی شخص نظر نہیں آتا جو اشیائی روحانیت کا دور ساغر جاری رکھے۔ اور شیراز و اصفہان کے سرود حقیقت سے ساکنان تیرہ خاک ہند کو مست و بیخود کر دے۔ اس تاسف آمیز احساس نے اس نظم کو زیادہ دلگداز کر دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ ہوا ہے باغ کی تو شاید گل ایک دن — سبزہ کی مانند بیگانہ یہاں ہو جائیگا

اب گرہ موقوف ہیں گونجیگی غنچوں کی چٹک — باغ پر احسان صبا کا رائیگاں ہو جائیگا

خندۂ گل کی ادا پر لوٹ ہوگا کس کا جی — بلبلوں سے کون اب ہمداستاں ہو جائیگا

ہے نوا سنج آجکل سن لو گرامی کو کہ پھر — نغمۂ بلبل سے خالی بوستاں ہو جائیگا

سنتے ہیں اک تازہ لٹریچر بنا ہونیکو ہے

دیکھتے ہیں ہم کہ یہ فن ہی فنا ہونیکو ہے

عام رسم ہے کہ ریویو نویس محاسن کلام کے ساتھ کچھ معائب بھی بیان کر دیتے ہیں تاکہ انکی تحقیق و تنقید پر مدحت سرائی کا الزام وارد نہ ہو۔ مگر کیفی صاحب دلی کے روڑے ہیں۔ اور مجھے ان کے کلام میں نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ البتہ چند دقیق الفاظ و اسالیب بیان کے سریع الفہم کرنیکا مشورہ دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ حضرت کیفی کی یہ حقانی نظمیں مقبول عام ہونگی اور ان کے قیام کشمیر کی ایک زندہ جاوید یادگار رہونگی۔

احقر ناظر

مقدمہ

از مدیران مجموعہ ہذا

شستگی رفتگی تراش خراش
سوچتے رہتے ہیں سدا نقاش

اگرچہ یہ مجموعہ بجائے خود کسی مقدمہ یا تقریب کا محتاج نہیں لیکن حضرت کیفی کے کلام کی شان اور ما بہ الامتیاز جو اُن کو اپنے معاصرین اور متقدمین سے حاصل ہے کماحقہ ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس لئے اُردو شاعری کی یہ روداد نہایت اختصار کے ساتھ سنائی جاتی ہے۔ حالت یہ تھی کہ گویا ایک حسینہ کو دو گروہوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک زیور و پوشاک کے بیشمار صندوق اور بقچے لئے اُس کے سر پر سوار تھا۔ کہ یہ سب ساز و سامان ایک دم اس پر لاد دے۔ تاکہ اس کے حسن و جمال کی تزئین ہو۔ دوسرا گروہ پنجے جھاڑ کر اُسکے پیچھے پڑا تھا کہ اسے اس مصرع کی زندہ مصداق بنا کر دکھائے ۔ ؎

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

تاکہ اس کا حسن دلفریب کسی عارضی سامان کا گرانبار احسان نہ ہو۔ حضرت کیفی نے اِن دونو گروہوں کو روکا۔ اور وہ اعتدالی صورت نکالی۔ کہ دونو رضامند

ہو گئے۔ اب اسکی تفصیل ملاحظہ ہو۔

بعض اصحاب شاعری کی دو جدا گانہ حیثیتیں قرار دیکر ان میں سے ایک کو خلاف فطرت اور دوسری کو عین فطرت تصور فرماتے ہیں۔ لیکن ہماری نگاہ میں شاعری ہر رنگ میں فطرت کی آئینہ بردار ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ وہ ایک ایسی عینک ہے جس سے فطرت کو اپنی صنعت صحیح صورت میں نظر آتی ہے شاعر درس فطرت کا ابجد خوان نہیں۔ بلکہ معلم ہے۔ جو اپنی سحر طرازیوں سے خود فطرت کو نئے سبق دیتا ہے۔ مصور یا شاعر کا کمال یہ نہیں کہ وہ فطرت کو خلعت عریانی پہنا کر پیش کرے بلکہ اسکی چابکدستی اسی میں ہے کہ وہ اسے ایسی نوک پلک سے آراستہ کر کے عرصہ شہود میں لائے۔ کہ جو دیکھے پہلی ہی نظر میں وارفتہ ہو جائے۔ اور مشاطہ تخیل کی معجز نمائی کسی تفسیر کی محتاج نہ رہے۔ مرقع سخن میں رنگ بھرنے کے لئے فطرت سے استمداد کرنا شاعر کا عجز ہے اس کے محسوسات سے تو یہ توقع ہے۔ کہ وہ فطرت کی کوتاہیاں ابھار ابھار کر دکھائے اس کے ایک ایک رنگ میں سو رنگ کی بہار دکھائے۔ تمثیل کے طور پر اس مجموعہ میں عشق اور باغ دل کے تمہیدی بند پیش کئے جاتے ہیں۔ جہاں فطرت نے ایک چمن کی آبیاری کر کے ہمت ہار دی۔ اس سرزمین سے ایک شاداب باغ پیدا کر دکھائے اس لئے اس شاعر کو جس کا دائرہ عمل فقط مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کے عکس لینے تک محدود ہو جگت استاد نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو مفتخوان شاعری کی منزل اول ہے۔ سر منزل اسوقت نصیب ہوگا جب اسکا قلم آئینہ رونما کی

سجائے خوردبین کا شیشہ بنجائیگا۔ واقعات نظم کرنے میں مورّخ کا تتبع کرنیسے شاعر ملک شاعری سے دُور ہو جاتا ہے۔ اور اُسکی نظم نثر موزون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا قلم لسانِ فطرت ہے جس میں استغراق۔ غلو۔ مبالغہ و دیگر صنائع و بدائع لکنت پیدا نہیں کرسکتے۔ ہر زمانہ کی شاعری اپنے دور کا مُنہ بولتا مُرقع ہُوا کرتی ہے۔ اور خواہ اُسے کوئی اسلوب ملے وہ ہر حالت میں فطرت نما اور حقیقت در آغوش رہتی ہے۔

گو اُردو زبان کا سنگ بنیاد خلفائے عباسیہ اور محمود غزنوی کے حملوں اور غوری کی معرکہ آرائیوں نے رکھدیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاہجہان کے عہد میں اُردو زبان کا پودا دفعتہً درخت بن گیا۔ اور اُس کے جانشینوں کے پانی دینے اور چھانٹنے سے پروان چڑھا۔ پھُول لے آیا۔ اور رنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہُوا۔ اور تن آسانی جزِ حیات بن گئی۔ اُردو شاعری نے اسی عیش و تنعم کے زمانہ میں جب ملک گیری کی اُمنگ اور جنگجوئی کی ترنگ دل و دماغ سے نکل چکی تھی۔ پرورش پائی۔ ایسے وقت میں جب ہوس پرستی طبائع انسانی پر مستولی ہو جائے۔ تصوف و الٰہیات کے رموز کا اظہار اور طریقت و شریعت کے نکات کی تضحیک عین ابنائے وقت کی فطرت ہے پست ہمتی کے دور دورے میں شاہنامہ اور سکندر نامہ تیار نہیں ہوتا اور نہ رندمشی کے گہوارہ میں جامی اور رومی پنپ سکتے ہیں۔ رنگ رلیوں کا دور تو محسوسات سفلی کے اظہار کا مقتضی ہے اسلئے ایسے وقت میں غزل کا

آسمان سخن کی قندیل چاکر چمکنا اور قصیدہ گو کا افضال رفتہ کی یاد سے ممدوح کا غم غلط کرنا ہی فطرت اور شاعری کی تطبیق ہے۔ کیونکہ ان سے اس وقت کے لوگوں کے رجحان طبعی کا صحیح اندازہ لگ سکتا ہے۔ کہ غزل اُنکی نیچر کی مظہر ہے اور قصیدہ اُن کے فقدان کمال کی ہجو ملیح۔

جب انحطاط ملی نے قدم آگے بڑھائے۔ تو میر و مرزا کی شاعری کیفیت کے اظہار سے عاجز نظر آئی۔ یا مُنڈا اول الفاظ میں خلاف فطرت ہوگئی۔ اب شاعری کا نیا باب کھلا اور جرأت اور انشا نے معاملہ کے اشعار سے محفل کو گرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں سوسائٹی کی حالت اس سے بھی بدتر ہوگئی۔ اور مذاق سلیم ذوق نسوانیت کا شکار ہوگیا۔ اب لکھنؤ اور دہلی کے بازاروں کو دیکھئے جس جگہ نوجوان ہتھیار سجائے اوپچی بنے پھرتے تھے۔ وہاں معشوقانہ وضع کے مرد اٹھکیلیاں کرتے نظر آئے۔ اُن کے لباس اُن کے کلام بلکہ طرز خرام سے عیاں ہوتا ہے کہ مردانہ پن زنانہ انداز کے پردہ میں روپوش ہوگیا ہے۔ اب انشا اور جرأت کی شاعری خلاف فطرت ہونے کے قریب ہوگئی۔ اور رنگین۔ ریختی کی سہاگ پٹاری لیکر بزم شعر میں آئے اور زمانہ شناسی سے طفیل قبول عام کا خلعت لے کر گئے۔ غزل اور ریختی خانہ جنگی میں مصروف تھے۔ کہ چرخ نیلوفری کی ایک گردش میں یہ محفل درہم برہم ہوگئی اور فارغ البالی اور تمول تنگ دستی میں بدل گئے۔ غرضیکہ معاشرت اور تمدن کی کایا پلٹ ہوگئی۔ علم و فضل فقط جلب تحسین کا آلہ اور گدائے متنبر کا کچکول نہ رہے۔ بلکہ کسب قوت لایموت کا

حصر انہیں پر آن ٹھیرا۔ ادبار ایک سخت گیر مصلح تھے اور مہلت و توقف کا روادار نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں عشق و عاشقی کے راگ الاپنا بدا شتا بیوقت کی شہنائی تھے۔ لہذا اب غزل سرائی بھی فطرت کے منافی معلوم ہونے لگی۔ زمانہ کی اس ادا کو میر انیس اور میرزا دبیر نے پہچانا۔ اور ان بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کے تن مردہ میں حیات تازہ ڈال کر نظم کو حسن و عشق کی کرشمہ آرائیوں سے مستغنی کر دیا۔ غزل کی جگہ سلام نے اور قصیدہ کی منقبت نے سنبھالی۔ پرانی شاعری سے تاکید خاطر کے طفیل یا آئمہ کرام کے اسمائے مقدس کی برکت سے یہ طرز تو ایسی چمکی۔ کہ مرثیہ گو بجائے بگڑا شاعر ہونے کے محفل ادب کا صدر نشیں ہو گیا۔ اب مشاہدات قدرت۔ جذبات فطرت۔ محسوسات عالیہ رزم و بزم سوز و گداز جا بجا جلوے دکھلانے لگے۔ اور شاعری کا تبادلہ شروع ہوا۔ جسے اسکا تمدن اور ہیجان خیالات کو مد نظر رکھکر نئی شاعری کہنا چاہیئے۔ مگر نیچرل شاعری کا نام متداول ہو گیا۔ لیکن حقیقت میں اسے ریلسٹک کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ ہمارے عندیہ میں اردو شاعری کاکل و زلف کے پھندے میں پھنسے رہتے بھی ریلسٹک تھی۔ فرق صرف اسوقت محسوس ہوتا ہے۔ جب ہم ماضی کو حال کی دوربین سے دیکھتے اور ارتقاء تمدن اور معاشرت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاعری کو ما ورائے انسان جملہ مظاہر قدرت تک محدود کر دینا تنوع خیال کے نقیض ہے اور اسلئے وہ شاعری جسے نیچرل کہا جاتا ہے۔ اپنی کوتاہ دامانی پر شرمسار نظر آتی ہے۔ دورِ حاضرہ

کے نکتہ خیال سے نیچرل شاعری وہی ہے۔ جو جذبات سفلی سے مبرّا اور دُور از کار باتوں سے مبرّا ہو۔ دُور از کار باتوں کا معیار بھی ہر زمانہ میں مختلف ہوتا ہے انیس اور دبیر نے باوجود اس جدّت طرازی کے تغزّل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور اسی سے گلدستہ کلام کی آرائش کرتے رہے۔

لکھنؤ حضرات اہل تشیع کا مرکز تھا۔ اس لئے مرثیہ کو وہاں بہت فروغ حاصل ہوا۔ لیکن دہلی میں یہ زیادہ پھلنے پھولنے نہ پایا۔ اور ادبائے دہلی طرزِ قدیم ہی میں داد سخن دیتے رہے۔ مذہب نے جہاں مرثیہ کو چار چاند لگائے ہیں۔ لکھنؤ میں اہل السنت و صاحبان ہنود نے اس میں چنداں دلچسپی نہ لی اور وہی اوراق پارینہ چراغ راہ بنائے رہے۔

حالت یہ تھی۔ کہ حضرت سر سیّد احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے شاعری کو اپنی تعلیمی و سیاسی جدوجہد کا قوّتِ بازو بنانا چاہا۔ اور خواجہ حالی مرحوم سے مسدّس مدوجزر اسلام لکھوایا۔ استعاروں اور تشبیہوں کی قیود سے آزاد ہو کر اور حسن و عشق کی داستانوں کو بالائے طاق رکھکر خواجہ صاحب نے اپنے کلام میں وہ تاثیر پیدا کی کہ اپنے طرز کے امام ہوگئے۔ بزم دوشینہ کے متوالے انگڑائی لے کر اُٹھے۔ اور اعتراضوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ لیکن یہ آواز زمانہ کی آواز کے خلاف تھی اس لئے صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اسی عہد میں بلکہ اس سے بھی پہلے مولانا آزاد مرحوم نے پنجاب سے اور مولوی اسمٰعیل مرحوم نے میرٹھ سے اسی قبیل کی

نظموں سے ضیافت طبع کا اہتمام کیا۔ اور اس دعوت شیراز سے تغزل اور صنائع و بدائع لفظی کو خارج کر دیا۔ اجتہاد کا تقاضی یہی تھا۔ اور اسلئے اسوقت کی ضروریات کو مدنظر رکھکر جو کچھ کیا گیا سچا تھا۔

اب شاعروں کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا عین سعادت سمجھتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو نئی شاعری کے دلدادہ تھے۔ صنف اول میں ساز اسقدر بلند آہنگ ہے کہ سننے کا عدم وجود برابر ہے۔ صنف ثانی میں بغیر ساز کے تان سُر اور آورد سے آزاد ہو کر الاپتا ہے۔

جب یہ معلوم ہُوا کہ دونو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی منزلت رکھتے ہیں۔ تو یہ التزام ناگزیر ہو گیا۔ کہ ساز بھی بجے اور مغنی کی گلے بازی بھی سپاٹ نہ ہونے پائے۔ قدرت نے یہ کام حضرت کیفی کے لیے ودیعت کر رکھا تھا۔ اور یہ ان اوراق کے ملاحظہ سے عیاں ہو گا کہ وہ کس طرح اس سے عہدہ برا ہوئے ہیں اور نیچرل شاعری میں کس خوبی کے ساتھ شان تغزل دکھائی ہے۔ عروس سخن کو زیورات سے اس قدر گرانبار نہیں کیا۔ کہ بوجھ کے مارے گردن نہوڑائے رہے اور رُخ زیبا کی بہار نہ دکھا سکے۔ اور نہ ایسا سادہ رکھا ہے۔ کہ سہاگ لٹی معلوم ہو۔

حضرت کیفی کی ہر نظم کو تصوف اور ویدانت کا سنگم اور ہندی کا مقام اتصال کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ کیونکہ یہی خصوصیت انہیں دیگر

اساتذہ سے ممتاز کرتی ہے۔

انجمن ادب میں حضرت کیفی کسی تقریب با تعارف کے محتاج نہیں دُنیا جانتی ہے۔ کہ وُہ اقلیم سخن کے جہانگور دستیاج ہیں۔ اور ہندوستان بھر کے رسائل و جرائد اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں۔ کہ آپ تمام اصناف سخن پر قادر ہیں۔ اُن کے کلام کے متعلق کچھ کہنا سُورج کو چراغ دکھانا ہے خصوصاً جبکہ جناب ناظر کے ایسے شاعر اور نقاد سخن کا دیباچہ موجود ہو صاحب موصوف اس فن کے مرد میدان ہیں۔ اور خمخانہ کیفی کے سرور کا بہتر اندازہ لگانے کے اہل ہیں۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اوّل اوّل بڑے تقاضے سے جناب مصنف نے صرف پانچ ترکیب بند دئے لیکن بعد حُسن اتفاق سے انکی بیاض ہمارے ہاتھ آ گئی۔ اور جلدی میں اس میں سے چند اور نظمیں بھی نقل کر لیں۔ جو اس مجموعے میں داخل کی گئیں۔ اسلئے آپ جناب ناظر کے دیباچہ میں انہیں پانچ نظموں کا تذکرہ پائیں گے۔

یہ رسالہ جناب کیفی کے طبع ذخار کا ایک قطرہ یعنی کئی ضخیم بیاضوں کا ایک ورق ہے ارادہ ہے کہ اس با عظمت نظام کلام کو بالاقساط شائع کیا جائے اور اگر ملک نے اس کوشش کو بنظر استحسان دیکھا۔ تو قسط دوم کی اشاعت کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

محمد عُمر
نور آلہی

ادب اور شعر کی تجدید

اگست ۱۹۱۹ء میں حضرت بزمِ اکبرآبادی کی زیرِ صدارت غازی آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں دو ہزار سے اوپر سخن سنج اور سخن فہم شریک ہو کر دادِ غزل خوانی دینے گئے۔ اس موقع پر طرحِ مقررہ بیتے

آگہی ترجمانِ دل۔ نگاہِ واپسیں ہوتی

کے مطابق حضرت کیفی نے اس بھرے مجمع میں یہ نظم پڑھی جو سراسر غزل کی شاعری پر تعریض ہے۔ یہ خلاقی جرأت قابلِ داد و تقلید ہے۔ استادِ فن نے اس نظم کو ایسا دلچسپ بنایا ہے کہ باوجود مدعیوں کی تعریض کے اُن سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

(مدیر)

ادب اور شعر کی تجدید ربّ العالمیں ہوتی

نظر اغیار کی گر چشمِ دل میں جاگزیں ہوتی — ہماری سعی میں توفیقِ "اجر المحسنین" ہوتی

نظر آتی اُسے خورشید کی تنویر ذرّے میں — بجائے خوردہ بیں گر آنکھ اپنی خورد بیں ہوتی

جنوں کیسا کہاں کی اشک شوئی عشقِ صادق میں — نہ ہوتا چاک دامن میں نہ منہ پر آستیں ہوتی

گزاری عاشقی میں عمر پھر بھی یہ تمنا ہے — آگہی ترجمانِ دل نگاہِ واپسیں ہوتی

ابھی مجہول و عاطل عشق پر دل سے نکلتا ہے — نگاہِ آخری یارب نگاہِ اولیں ہوتی

جو کوشش ہے تو یہ اور دل کی خواہش ہے تو بس اتنی — جہاں کو پھونک دیتی ایسی آہِ آتشیں ہوتی

محبت ہے وہ شعلہ جو دبانے سے بھڑک اُٹھتا — کسک اس درد کی وہ ہے جہاں اٹھتی وہیں ہوتی

نہ پہنچا خاکِ راہِ عشق تک کتنا جھکا گردوں — فرومایوں کی ہمسایہ نہیں یہ سرزمیں ہوتی

جدا اس عشق سے ہے یہ خیالی عشق شاعر کا — ہے آبِ زر بھلا سونے کے پانی میں کہیں ہوتی

سخن سنجی کی ہم بس یہ غرض غایت سمجھتے ہیں
کہ بزم شعر میں پیدا صدائے آفریں ہوتی

اثر اخلاق پر جو اس سخن سنجی کا پڑتا ہے
نہ کیوں بے ربط اس سے اپنی تحریر حسیں ہوتی

مذاق شعر بگڑا اور طرز معشرت بگڑی
طبیعت کیوں نہ دردانگیز باتوں سے حزیں ہوتی

اثر کو کر دیا محدود و مطلق درد میں ہم نے
نہ کیوں تعریف اچھے شعر کی اندوہگیں ہوتی

محاسن میں سخن کے گرچہ درد و سوز ہیں شامل
مگر موقوف انہیں پر شعر کی ہستی نہیں ہوتی

خواص اور عشق ہوتے ہم ردیف شعر تو دل میں
حسد ہوتا نہ عالم سوز نار بغض و کیں ہوتی

ادب اور شعر سے جو کام دنیا میں نکلتے ہیں
یہاں بھی انکی وقعت کاش تا نور یقیں ہوتی

ادب اور شاعر ایسے تھے یہاں اک بات بھی جن کی
برائے دفع صد آفات سد آہنیں ہوتی

چلن ایسا کہ ان کی ہاں میں ہوں کن کی تاب و طاقت تھی
نہیں جس بات کو کرتے قیامت تک نہیں ہوتی

جو کہتے منہ سے وہ کرتے، وہی کرتے جو شایاں تھا
عمل کیا ان کی غور و فکر بھی حق کے قریں ہوتی

اگر باغ سخن کو خون دل سے سینچتے شاعر
زمیں شعر میں پیدا فضائے علیّیں ہوتی

حقیقت کھینچتا جذبات و محسوسات کی شکلیں
تو حصہ میں قلم کے عظمت روح الامیں ہوتی

دلی جذبات پر گر نظم کا نظم و نسق ہوتا
زباں سے جو نکلتی بات بشاش و دلنشیں ہوتی

بھرے ہوتے یہاں خرمن حقائق اور معانی کے
بجائے نکتہ گر طبع اپنی خوشہ چیں ہوتی

بلندی پر تو ہوں ہیں اور رفعت عزم ہوتی
تو پشت خاک اپنی زینت چرخ بریں ہوتی

زبانوں میں اگر اردو کو جا ملتی تو کیا ملتی
نہ کیوں وقعت جہاں میں اپنی کم سے کمتریں ہوتی

جو اخذ و ترک و جلب منفعت ہوتا شعار اپنا
تو پھر قبضے میں اپنے دولت دنیا و دیں ہوتی

جو لینا چاہیے تھا کام اگر وہ شعر سے لیتے
مکاں سے لامکاں کی بلکہ تک زیر نگیں ہوتی

جلے دل کی یہ باتیں گوش دل سے گر سنی جاتیں
تو یاروں کی زباں پر بجائے نفریں آفریں ہوتی

تمنا ہے یہ کیفی کی یہی اسکی دعا تجھ سے
ادب اور شعر کی تجدید رب العالمیں ہوتی

یہ دلاویز نظم ۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو لکھی گئی اور رسالہ مخزن بابت ۱۹۰۸ء میں نظر فروز دیدہ سخن ہوئی۔ اس میں روئے سخن کس کی طرف ہے۔ یہ آخری بند سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس نظم کا ہر بند انجیل کی آیت "خدا محبت ہے" کی تفسیر اور مسائل فلسفہ الٰہیات کی تعبیر ہے۔ (مدیر)

اُڑانے کو تو بلبل ہے بہت طرزِ فغاں میری
کہاں سے لائیگی یہ سوزشِ دردِ نہاں میری

ہما کو حوصلہ کب تھا کہ میری آگ میں جلتا
سلگتی ہیں ابھی تک سوزِ دل سے ہڈیاں میری

نہ کھنچتا دار پر تنہا جو منصور اس زمانے میں
کہ معنی کا ہیں دفتر کھولتی خاموشیاں میری

نہ ہوگی بند یہ شعلہ فشانی اور شرر ریزی
برنگِ شمع کاٹیں گر سرِ محفل زباں میری

سویدائے دل اپنا ہے سکونِ جذب کا مرکز
بلائیں رات دن لیتے ہیں مہر فرقداں میری

دلِ عشق آشنا کو ہیں حرم اور بتکدہ یکساں
زبس ششدر ہے یکرنگی سے نیرنگِ زماں میری

مری دلبستگی سے ہیں شگفتہ باغ میں غنچے
سکھاتی چہچہے بلبل کو ہیں خاموشیاں میری

کرینگے قدر یاد آئینگی جب انکو مری باتیں
نہ ہونگا میں مگر ہوگی زباں پر داستاں میری

اگر میں ہوش میں ہوتا تو پھر کیا جانے کیا ہوتا
فروغ دیدۂ عالم ہیں یہ بدہوشیاں میری

پاپاپ دلکے ٹکڑے ہیں نہیں لخت جگر لب پ
سمجھ میں کب تمہاری آئیگی یہ داستاں میری

تم اے مفتون ہر رنگ جہاں جانوگے کیا مجھکو
نہ جبتک آپ کو پہچانو ۔ پہچانوگے کیا مجھکو

مرا دل ہے کہ اک گنجینہ ہے اسرار پنہاں کا
سویدا ہے کہ مرکز ہے محیط چرخ گرداں کا

حرارت جو زمیں کے قلب میں مخفی و مکنوں ہے
وہ اک پرکالہ ہے عاشق کے دلکے داغ سوزاں کا

ضرورت کیا مجھے سیر گل و ریحاں کی اے بلبل
دل پرداغ پر عالم یہاں ہے باغ رضواں کا

چمن میں گل ہے گلچیں تو مجھے ۔ بو میں دل ہے فریفتہ
کھلا تو یہ کھلا اہل نظر پہ راز بستاں کا

کیسے لوں اور کیسے پھینکوں بچا ہوں اور کیسے جاں لوں ستم
مری آنکھوں میں تو ہے خار بھی گل اس گلستاں کا

حواسوں پر ہو قابو تو ہے نفرت اور رغبت بھی
ہے یکساں نفس کش کو نیک و بد ہر فرد انساں کا

کمال عشق میں یہ ہوگئی ہے کیفیت دلکی
نہ ہے امید وصل اور ہے نہ اسکو خوف ہجراں کا

تڑپ جاتی ہے بجلی اور سورج کانپ اٹھتا ہے
یہ عالم دیکھکر عاشق کے دل کے سوز پنہاں کا

بھرا ہے دل میں جو سوز محبت کسکو دکھلاؤں
نظر اندھی ہیں چشم دہر میں کس طور سمجھاؤں

مثال سبزۂ بیگانہ بیبان گلستاں ہوں میں
نگاہ غور سے دیکھو تو اس گلشن کی جاں ہوں میں

صدا ہوں میں شکست رنگ گل کی گاہے گلشن میں
تو شاخ گل پہ گاہے عندلیبوں کی فغاں ہوں میں

کبھی ہے آسماں پر مثل فوارہ دماغ اپنا
کبھی اہل پہ پستی کو دے سیل رواں ہوں میں

ہمیں ہوں سرچشمہ تسنیم و کوثر چشم بینا میں
سراب دہر کے وارفتہ کو ریگ رواں ہوں میں

گرجتا ہوں کبھی میں رعد ہو کر بام گردوں پر — ستارہ پردوں میں یا دل کے کبھی برق تپاں ہوں میں
نظر پسماندہ آتا ہوں اگرچہ گرد کی صورت — دل جویا کو آواز درائے کارواں ہوں میں
نہاں ہوں گر تو یوں جیسے کہ بو پھولوں میں نہاں ہے — عیاں ہوں تو نشر اُٹھ کر بصورت عیاں ہوں میں
وہاں ہوں میں جہاں اپنی خبر کو بھی نہیں ممکن — بتاؤں کس طرح تم کو کہ کیا ہوں اور کہاں ہوں میں

بتاؤں کیونکہ اے اہل جہاں تم کو کہ میں کیا ہوں
جدا سب سے ملا سب سے ہوں نیرنگ تماشا ہوں

سمجھتا اس چمن میں کون انداز فغاں اپنا — نہ بلبل ہمصفیر اپنی نہ گلچیں رازداں اپنا
وہ زاہد تیرے مغز خشک میں کیسے سما جائیں — بتاتا ہے جو باتیں راز کی پیر مغاں اپنا
علائق کی رہیگا قید زنجیروں میں تو کبتک — اگر ان سے رہا ہوتا تو تھا کون و مکاں اپنا
جو ہو مخلوق کے خادم تو ہو ممتاز خالق کے — جو تم سارے جہاں کے ہو تو ہے سارا جہاں اپنا
تماشا ہے مٹا کر آپ کو کل آپ بن جاؤ — بھلا کب اہل صورت سمجھیں یہ راز نہاں اپنا
بقا دل سے فنا دل سے وصال و ہجر ہے دل سے — جہنم ہے یہی اور ہے یہی باغ جناں اپنا
جو بلبل اور شاخ گل یکساں ہے شاخ زعفرانی — بنائیں کونسی ٹہنی پہ بلبل آشیاں اپنا
جلی خود اور جلائے شمع نے کیوں اپنے پروانے — بناتی بزم میں وہ کاش اک دل ہمزباں اپنا
نوا بلبل کی سنکر کیا ہوا جو چپ لگی گل کو — یہ لازم تھا بناتی باغ کو ہمداستاں اپنا

ازل سے اس میں غوطے کھا رہے ہیں عالم و دانا
کھلا یہ راز اسی پر جس نے اپنے آپ کو جانا

خودی کو جو مٹا بیٹھے نظر اُنکی خدا تک ہے — کہ شوق دید اے ناداں نگاہ نارسا تک ہے

فغاں اور اشکباری کیسی اور کیا گریۂ زاری — یہ کیفیت تو عشق صبر و تمکیں آزما تک ہے

اگر ہو عشق صادق شکوۂ رنج و تعب کیسا — نظر چشم ہوس کی نالہ و آہ و بکا تک ہے

نہیں ذوقِ نظارہ بھی کچھ ان صورت پرستوں کو — نظر انکی تو رنگ عارض و زلف دوتا تک ہے

ملی جب فقر کی دولت تو شاہی کیا ہے دنیا کی — ضرورت شمع کی سلطان خاور کی ضیا تک ہے

صفائے قلب حاصل کر کہ آپ آپ ہیں نظر آئے — ضرورت آئینہ کی تو فقط دل کی صفا تک ہے

یہاں ہے وہ دیا روشن کہ جو بے آگ جلتا ہے — تجلی ماہ کی تو نور مہر پر ضیا تک ہے

دل روشن سے کیا نسبت ہے اس خورشید رخشاں کو — کہ نور مہر بھی تو دورۂ صبح و مسا تک ہے

اگر دل میں تجلائے حقیقت جلوہ گر ہو جائے
تو نیرنگیٔ عالم کی تجھے ساری خبر ہو جائے

پئے سیر و تماشا کیا تم اس گلزار میں آئے — ہوئے گل کے نہ چشم نرگس بیمار میں آئے

سمائے چشم عاشق میں حبیب۔ اک بات ہے یہ تو — مزا جب ہے نظر عاشق نگاہ یار میں آئے

گلستاں کی کرو گر سیر تم چشم بصیرت سے — ثمر دانہ میں دیکھو اور نظر گل خار میں آئے

یہ مانا عارضی ہے پر ہے نقل اصل تو زاہد — وہ مدہوشی جو قلب دیدۂ سرشار میں آئے

سکوں روح کا پیدا اساں ہم آکی موجوں میں — تلاطم گر ترے دل کے یم ذخار میں آئے

دوئی کو گر مٹا دے تو خودی کو گر اڑا دے تو — تو شکل یار پھر تجھکو نظر اغیار میں آئے

کہاں تھے ہم یہیں تھے۔ اور یہیں ہونگے جہاں جاؤ — کہاں جائیں نظر ہر شے جو شکل یار میں آئے

نہیں یہ گلستاں آہ و بکا شور و فغاں کی جا — رہے بس دم بخود بلبل جو اس گلزار میں آئے

ہے ہم سے ابر اس سے رود پھر واصل ہے وہ یم میں
بتاؤ پھر تمیز و فرق کیا ہے اس میں اور ہم میں

غرض کی لوث سے انساں کا دل اگر بری ہو جائے ۔ تو پھر کون و مکاں پر اسکو حاصل افسری ہو جائے

کھلیں سب بند لگے ان سے راز پھر رہ جائے کیا اوجھل ۔ کھلونا ایک بچوں کا یہ سحر سامری ہو جائے

نہیں ہیں سنتے عیوب ظاہری بھی عشق صادق میں ۔ کہ فیض عشق سے کنجا بھی اندر کی پری ہو جائے

کھلی ہو جسکے دل کی آنکھ پھر کیا اس سے پردہ ہو ۔ اسے راز حیات و موت امر سرسری ہو جائے

ہوا جو خاک راہ عشق میں اسکو ملی عظمت ۔ کہ حاصل مر کے ہی تانبے[1] کو عالی گوہری ہو جائے

چھنکے جو سوزش دل سے حیات جاوداں پائے ۔ کہ جتنی بار جائے آگ میں وہ اتنا کھری ہو جائے

وہی ہیں عشق میں معشوق جو ہیں عاشق صادق ۔ اگر تو من کو مارے تجھکو حاصل دلبری ہو جائے

دل گل میں ہو داغ لالہ پھر کیا خار کا کھٹکا ۔ کہ مجھ کو عشق خوفوں اور خطروں سے بری ہو جائے

محبت کی سمجھنا کون ہے یہ رمزیں اور راہیں
یہاں تو پابجولاں حلقۂ گیسو میں ہیں آہیں

تو ہے اشکال گونا گوں عالم کے تماشائی ۔ بتا تو ہیں یہ سب نیرنگیاں کس رنگ سے چھائی

گل و سنبل یہ کیا ہیں باغ کیا ہے کون مالی ہے ۔ کبھی گلزار عالم میں یہ سوچا تو نے سودائی

لڑائی آنکھ نرگس سے کبھی سنبل سے تو الجھا ۔ نہ سمجھا راز معنی کو تو اے صورت کے شیدائی

ہنسا ہے خندۂ گل سے تو رویا شور بلبل سے ۔ حواسوں کے فسوں کی سیر واں تجھکو کیا بھائی

شہود و شاہد اصلی مشاہد ہیں نظر آئے ۔ جو حاصل ہو تری چشم دروں کو نور بینائی

عیاں کثرت میں ہو وحدت نہاں وحدت میں ہو کثرت ۔ بہ شان لاشریک اور ہے یہی انداز یکتائی

[1] معدنیات کی قسم ہے جیسے لوہا۔ تانبا وغیرہ

بتوں کی شکلِ زیبا پہ تو کیا مفتون شیدا ہے
مجیدا گل نے کب زندانِ صورت میں جگہ پائی

ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں ہے مثل تری
دکھائی دے جو دیکھے آپ میں وہ شکلِ رعنائی

یوں ہی دیکھو تو دنیا ایک ناٹک ہے فسانہ ہے
نظر ہو اصل پر تو پھر حقیقی کارخانہ ہے

سنی تم نے جو یہ مجذوب کی بڑ یا بر فرزانہ
سمجھ لینا نہ اسکو ایک گل و بلبل کا افسانہ

مگر دوئے سخن اپنا تھا ان سے جو ہوں عقل صلیل
جو محسوسات اور جذبات بالکل ہوں بیگانہ

غرض کاوش ہو جنہیں نہ غیریت کی تاریکی
شراب معرفت سے جو ہوں بیخود اور مستانہ

مگر مکتب میں قدرت کے ابھی تک ہیں جو ابجد خواں
سبق اخلاق کا لازم ہے انکو پہلے سکھلانا

دکھانا ہے انہیں نقشہ ثوابوں اور عذابوں کا
بجا ہے ان کو ترکِ رسم کا افسانہ بتلانا

صحیفوں میں جو لکھا ہے رہیں پابند وہ اسکے
کتب اخلاق کی انکے لیے اعلیٰ ہیں پیمانہ

لگائیں کٹ کھنوں کی شوق میں دل بستی جو ہیں
اگر معہود دل ہو پنجہ کش[۱] سے پنجہ لے جانا

اکھاڑے وہیں وہ پاکر تربیت یوں آئیں دنگل میں
وہ صالح اور زاہد بن سکیں پھر چکھیں یہ پیمانہ

نہیں مفتوں ہر اک چہرہ با جمالِ ماہِ تاباں پہ
نہیں گرتا ہے ہر پتنگا لیک ہر شمعِ سوزاں پہ

---

[۱] سید محمد رضوی مرحوم دہلوی - اپنے عہد کے بہترین نستعلیق نویس اور زبردست پنجہ کرنیوالے ۱۸۵۷ء میں جاں بحق ہوئے - پنجہ کش یا میر پنجہ کش ان کا لقب تھا ◆

یہ نظم اپریل ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے اور رسالہ منیر امرتسر بابت ماہ مئی ۱۹۰۹ء
میں شایع ہو چکی ہے۔ پہلا بند قصیدہ کی تشبیب کی طرح تمہید ہے اور غزل
کے تمام مدارج پر چھایا ہے۔ اس نظم میں کیفر کردار مع سوالات دینی پر
روشنی ڈالتے ہوئے ریاکاری اور رسمی اعتقادات کی قلعی کھولی گئی ہے (مدیر)

کبھی عشقِ صنم سے قتل کا ایما بھی ہوتا ہے
دلِ عاشق شہادت سے پھرے ایسا بھی ہوتا ہے

نقاب اُٹھا جو رُخ سے گیسوئے پرخم ہو حائل
یہ عقدہ رہتا ہے لاحل یونہی۔ گرد ابھی ہوتا ہے

وفا کے امتحاں پہ بھی نکل آتی ہیں شاخیں
کبھی سوزِ فراق شعلہ رو ٹھنڈا بھی ہوتا ہے؟

کبھی خود دھری محفل سے اُٹھکر بیٹھ اُٹھاوے
بتاؤ سرکشی کا کچھ اسے یارا بھی ہوتا ہے؟

جو پورے اُترے ہر اک امتحاں میں وصل میں بھی
حیا کا اُس طرف سے حیلہ بیجا بھی ہوتا ہے

اسی کی دلبری پہ عاشق ہیں کہ گئے ہیں
کبھی جیتے ایفاء وعدہ فردا بھی ہوتا ہے

حسد عنا رو دیکھا ہے کبھی لبس عنادل کے؟
بغل میں شاہدِ گل کی اگر کانٹا بھی ہوتا ہے

چلو ہیں پرافشانی میں یہی شاہد سحر کرتی
کبھی انکی طرف مائل مہ زیبا بھی ہوتا ہے

ہوئی آزاد جیتے جی نہ عشقِ سرو سے قمری
غلامی کا کہیں گردن میں طوق ایسا بھی ہوتا ہے

مجازی کی بھی کیفیت ہے غیریت مٹا دیتی　　عزیز قیس لیلیٰ ساں سگ لیلیٰ بھی ہوتا ہے

فسانے رات دن سنتے ہو یہ عشق مجازی کے
کرشمے تم کو پھر چونکائیں کیوں عشق حقیقی کے

کرشموں کو محبت کے تو اک افسانہ سمجھا ہے　　رموز عشق کو ناداں نہ سمجھیگا نہ سمجھا ہے
بتوں سے آشنائی کی رہا نا آشنا حق سے　　جو سب کا ہے اسی کو نا سمجھ بیگانہ سمجھا ہے
جو خالق کی محبت ہو تو خلقت تجھکو پیاری ہو　　مگر پردہ ہے دل کا جسکو تو اک شانہ سمجھا ہے
سویدائے دل حسن آفریں ہم اسکو سمجھے ہیں　　جسے تو خال رخسار بتاں کا دانہ سمجھا ہے
نظر سے بیخبر کی کو اور خودی کو سر سے کھوتا ہے　　تو کیا اک کھیل یہ پیمانہ رندانہ سمجھا ہے
پڑیں پتھر سمجھ پر تیری تو سمجھا تو کیا سمجھا　　کہ دانائے رموز دہر کو دیوانہ سمجھا ہے
شہ گل تخت گلشن سے اتر کر اس سے ملتا ہے　　تو جس سبزے کو اس گلزار میں بیگانہ سمجھا ہے
وصال روح و تن اک عارضی شے ہے سمجھ اسکو　　مسافر خانہ ہے وہ تو جسے کاشانہ سمجھا ہے
بھلا ہوا کے اک معبد تجھے ملجائیگی جنت؟　　متاع خلد کا دولت کو کیا بیعانہ سمجھا ہے
دل و دست و زباں سے کام لے تو بے غرض ہو کر　　تو ممکن کو بھی کیا بازیچۂ طفلانہ سمجھا ہے

اسیر حس ہے جبتک اور پابند علائق ہے
سمجھتا ہے غلط دل میں فروغ عشق صادق ہے

اگر شہرت کی خواہش پاؤ گے تم نامداروں میں　　تو سودا امر و طاعت کا ملے طاعت گزاروں میں
خزاں میں بھی جو عشق گلشن خار شاخ گل جیسے　　ملیگی ایسی ہی بلبل آپ کو شاید ہزاروں میں
حیات جاوداں ہے خستگی افسردگی دل کی　　وہی ہیں زندۂ جاوید جو ہیں دل فگاروں میں

ابھی تیغ ادا کھنچ جائے تو کھل جائے عالم پر — کہ ہیں وارفتۂ جاں کون کون ان جاں نثاروں میں
کوئی شیدا ہے گل انہیں نہیں ہیں سب ہی گاہک ہیں — سناتے پھرتے ہیں نغمے عنادل جو بہاروں میں
کہا رندوں نے کچھ اور دل مثال خم ابل اٹھا — یہی صبر و سکوں ہے آجکل پرہیزگاروں میں
یہیں زندگی کو کہتے ہیں زندہ دلی جاہل — نہ پائی مطلقاً روحانیت ان جانداروں میں
حواس خمسہ کا چاروں طرف سے اپنے نرغہ ہے — ملا ایسا دل مضطر بھی ہے پانچوں سواروں میں
بہشت ہیں حور یہ اس سے کہ وہ سو حور ہر جا ہے — بنے شیخ و برہمن بھی ہیں اسکے پاسداروں میں
یہاں تو خود فراموشی ہی شرط ہوشیاری ہے — بنے پھرتے ہیں کیا یہ اہل دنیا ہوشیاروں میں

ذرا سی آرزو پر تو تمہارا دم نکلتا ہے
اور اس پہ زعم ہے ہر سانس میں سوہم[1] نکلتا ہے

حرم کو گھر خدا کا اور صنم کو ہم خدا سمجھے — اسی کو معرفت اور گیان کی بس انتہا سمجھے
جو ہوتا عشق صادق دل میں پتھر سے کبھی کم کرتا — بتوں کو جب اپنا کر سکے لیلے خدا سمجھے
دیا پیسہ جو آج اک تھان کر کل لاکھ پائینگے — سخاوت کو بھی ہم بیوپار کا بیج و ثمر سمجھے
ابھی تک ہم نہ سمجھے حیطۂ افعال کی وسعت — کئے کا اپنے پھل پایا تو اسکو ہم سزا سمجھے
لکھا ہوئی کا بس سمجھے خدا وہ ہے مثل اپنی — نہ لکھا پڑھ سکے اپنا تو قسمت کا لکھا سمجھے
جو حصہ آئی باقی فاضل اپنی پچھلی میزان کی — تو جاہل اسکو لطف خاص اور حق کی عطا سمجھے
بھلا پیغمبری ہر آنکر لانے والا پاتا ہے — کرم کے پھل کو دین اللہ کی حکم قضا سمجھے
یہ مانا حشر میں اٹھنا پس مردن تو لابد ہے — مرادف انتقال روح کا کیونکر فنا سمجھے

[1] فلسفۂ وحدانیت کا اسم اعظم

نہ سمجھے وہ حقیقت زندگی اور موت کی اب تک — اجل کو جو طبیب اور موت کو دکھ کی دوا سمجھے
پڑیگا تم کو یہ بھگتان مر مر کے بھی بھگتنا — یہ ڈگری ہے بلا میعاد تم اس کو ہو کیا سمجھے

نہ جب تک نور خود اس چاند میں جلوہ نما ہوگا
تناسخ سے ہلال و بدر کے کیونکر رہا ہوگا

عبث روتا ہے اے وحشی گریباں و رواں کو — لباس اپنا سمجھ تو دامن کوہ و بیاباں کو
پھنسے ہیں سبحہ و زنار کے جنجال میں دونوں — نکالیں کس طرح اس قید سے گبر و مسلماں کو
رہائی خواہشوں سے خواہشوں کا ترک ہے اے دل — ہوا میں مشتعل دیکھا زیادہ نار سوزاں کو
نکلتا ہے یہ جتنا اسقدر ہی بڑھتا جاتا ہے — سجا ہے کہتے تار جنتری گر دل کے ارماں کو
تصنع کا نہیں محتاج ہرگز شاہد قدرت — جھکائی کہکشاں نے اپنی پیشانی کب افشاں کو
نہیں حاجت کبھی سنگ فساں پر تیغ ابرو کی — ضرورت اسکی ہے البتہ شمشیر صفاہاں کو
عرض کی گرچہ ہستی ہے مسلم ذات جوہر سے — بغیر اسکے مگر جوہر نہ پائے شکل امکاں کو
مگر یہ دونوں اک صورت سے ہیں ملزوم و لازم بھی — یہی ہے راز تکوین جہاں سمجھے گر انساں کو
حرارت سے جمادی شکل حیوانی پکڑتا ہے — نہیں حاجت ذرا اسکی اگرچہ مہر تاباں کو
بقائے قطرہ ہے جیسے سمندر میں فنا ہونا — یونہی انسان کھو کر خود کو پائے ذات سبحاں کو

مٹا لے شخصیت کو جو - وہ پاتا ہے خدا آخر
بقا سے تھی فنا اول - فنا سے ہو بقا آخر

حرم اور دیر میں تم نے نہ جسکا پر تو دیکھا — وہ نور پاک ہمنے ذرے ذرے میں چھپا دیکھا
عبث تو نار کے گلزار ہو جانے پہ مفتوں ہے — شرار دل میں تو کیا جانے اہل دل نے کیا دیکھا

پدر کا علم حاصل کر تو میراثِ پدر پائے ‏ لبِ عیسیٰ بھی محتاجِ دمِ آبِ بقا دیکھا

سما سکتی ہے وحدت میں کہاں تمیز کفر و دیں ‏ یہ دعویٰ ہی غلط ہے مدعی نے کب خدا دیکھا

بنے سب ایک سے اعداد پھر بھی وہ اکیلا ہے ‏ جہاں کے کیف و کم کا جوڑ ہم نے سب لگا دیکھا

وہ خود کھویا گیا جس نے ذرا سا بھی پتا پایا ‏ نہ دیکھا اس نے پھر کچھ جس نے وہ نورِ ہدیٰ دیکھا

کرو گر بند کان اور آنکھ تو اسکو سنو دیکھو ‏ تماشا اسکو سمجھو تم نے ہے جو کچھ سنا دیکھا

چھپا ہے وہ ہر اک شے میں کہاں ہم عجز ظاہر ‏ مٹی ما و منی جسکی اسی نے برملا دیکھا

وہ کب چھپتا ہے اعجاز اور اوتار دیکھے بندے میں ‏ بہت کچھ خرقِ عادت کو بھی ہم نے آزما دیکھا

تھا فخرِ جامِ جم آئینہ دکھا دیتا جہاں باں کو ‏ جہاں تو یوں بھی ہے اہلِ جہاں نے بارہا دیکھا

بہت ہیں یوں تو اس دنیا میں صورت دیکھنے والے

نہیں ملتے مگر نورِ حقیقت دیکھنے والے

جو صبح و شام ناقوس اذاں کا غل مچاتے ہیں ‏ وہ کب سوتے جگاتے ہیں جاگتوں کو وہ سلاتے ہیں

ہیں یہ سب خارج از آہنگ جتنے شبد سنتے ہیں ‏ نہ ہر اک کو سناتے ہیں جو سچا راگ گاتے ہیں

یہ قیدیں ایک حد تک ہیں ضروری ہاں ہیں لیکن ‏ جواں ہو کر جو سناتے ہیں ہنسی پر دھول کھاتے ہیں

فنا فی العشق ہو جانا کمالِ عشقِ صادق ہے ‏ وہ از خود رفتہ ہیں عاشق جدا اسکا بدن پیتے ہیں

ثوابِ حجِ اکبر تھا اگر اک دل میں گھر کرتے ‏ یہ کس کے واسطے لوگ اسقدر مسجد بناتے ہیں

بنایا اس نے انسان اپنے ہاتھوں سے یہ مبہم ہے ‏ مگر انسان عالم آفریں خدا سا بناتے ہیں

گھڑے ہیں ایسے افسانے کہ توبہ ہی بھلی ان سے ‏ خدائی تو بگاڑی تھی خدا کو بھی بناتے ہیں

کسی سے کوئی بھی ملتا نہیں سُر تال اور لے میں ‏ غرض سب منکرِ وحدت کے اپنے اپنے راگ گاتے ہیں

بیاں اُسکا مزا کیا ہو یہ گُپ چُپ کی مٹھائی ہے
جو مست اس فن میں ہیں کب اُونچی تانیں وہ لگاتے ہیں

سُنیں گر گوشِ دل سے تو ہے اک اک نغمہ الگ دفتر
جو باتیں راز کی ہم آپکو بتلائے جاتے ہیں

خودی جب محو ہو جائے وفورِ عشقِ صادق میں
نہیں رہتا ہے کچھ بھی فرق معشوق اور عاشق میں

فنا فی العشق ہونیکا کبھی گر امتحاں ہوتا
مسیح و خضر کو مرنا حیاتِ جاوداں ہوتا

خودی کے خون کو فرہاد اگر تیشہ ترا چلتا
تو اک قطرے سے جُوئے شیر کا چشمہ رواں ہوتا

اگر خود شمع جلکر بزم کو روشن نہ کر دیتی
تو جگمگھٹ اس پہ وارفتہ پتنگوں کا کہاں ہوتا

جگر کاوی کا صدمے پر نہ صدمہ جھیلتا موتی
تو پھر کس طرح زیبِ گردن و گوشِ بتاں ہوتا

وفورِ نور سے ہی چشمِ مردم ہو گئی خیرہ
وہ پردے میں چھپا رہتا تو آنکھوں میں عیاں ہوتا

جو وہ ہوتا نہیں تو مجھ کو تجھ کو کب نظر آتا
جو رہتا میں ہی میں کب چشمِ عالم سے نہاں ہوتا

مجازی اور حقیقی میں سرِ مو فرق ہے ہمدم
نہ پڑتی آنکھ لیلیٰ پر تو پھر مجنوں کہاں ہوتا

جو سچ پوچھو گُل کی شیدا تھی تو کانٹا بھی سے گل تھا
خزاں میں لب پہ بلبل کے نہ یہ شور و فغاں ہوتا

ہوا کو جو کہ ہے موجود ہر جا دیکھ سکتے ہو
جو ہے اُس میں بھی چشمِ ما و تو میں کب عیاں ہوتا

عجب ہے گو مگو کی بات کھُل کر کیا کہے کوئی
جو ہوتی بات کہنے کی تو کچھ مطلب بیاں ہوتا

نہ دل اور دردِ دل رہتا نہ دلدار و عدو رہتا
کمالِ عشق ہو جاتا تو میں رہتا نہ تو رہتا

یہ نظم فروری سنہ ۱۹۱۱ء کو لکھی گئی۔ اور رسالہ ادیب الہ آباد اور رسالہ کمال دہلی کے صفحات کی آرائش ہوئی۔ دُنیا بھر کے شعرا نے بقدر ہمت اسی موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن صلاحیت مواسات نے جو حضرت کیفی کا خاص رنگ ہے اس نظم کو اسی موضوع کی دیگر بے شمار نظموں سے ممتاز کر دیا ہے۔ شاعر کو عشق ہر انداز میں قابل ستائش نظر آ رہا ہے۔ خواہ حقیقی یا مجازی یا ممتا ہو اور وہ ازبس دل نشین طریق سے تاریخ اور روایات زمانہ سلف سے مثالیں پیش کرکے یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ عشق خواہ بندے کو خدا سے ہو یا کسی سرورِ دیں کو اپنی اُمت سے۔ خواہ معشوق مجازی سے ہو یا اپنی اولاد سے بیٹی کو باپ سے ہو یا بیوی کو خاوند سے ہو۔ مگر غرض سے ملوث نہ ہو۔ پرستش کے قابل ہے۔
محض اسلئے کہ کسی شعر پر شعر کہہ کر تقابل کی خواہش حضرت کیفی کا شعار نہیں۔ ہم یہ بتا دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ کہ اس نظم کے ساتویں بند کا مطلع ؎

مل گیا مٹی میں جو دل عالم آرا ہوگیا
عرش کی آنکھوں کا طفل اشک تارا ہوگیا

اتفاق سے ناسخ اور ذوق کے مندرجہ ذیل مطلعوں سے متماثل ہوگیا ہے

اِس اتفاقیہ بات کو نقابلِ خیال نہ فرمایا جائے۔

تاریخ

مرتبہ کم فرطِ رفعت سے ہمارا ہوگیا
آفتاب اونچا ہوا اتنا کہ تارا ہوگیا

ذوق

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہوگیا
جس طرح پانی کنویں کی تہ میں تارا ہوگیا

(مدیر)

بزم میں ہے تذکرہ میں آج کیا کہنے کو ہوں
دل میں ہے جو کچھ مرے وہ برملا کہنے کو ہوں

دعوتِ روح آج میں احباب کے کرتا ہوں پیش
خوانِ یغما پر عزیزوں کو صلا کہنے کو ہوں

ہوں میں کہنے کو جنوں ہی ہے کلیدِ قفلِ دل
اور اس چاکِ گریباں کو قبا کہنے کو ہوں

تم تو اپنٹ اور پتھروں کو پوجتے ہو رات دن
عشق کو لیکن میں اب نورِ خدا ہی کہنے کو ہوں

رحم آتا ہے مجھے حالت پہ معشوقوں کی آج
کیونکہ میں عشاق کو جادو نوا کہنے کو ہوں

چاہتا ہوں وصل سے تعبیر کرنا موت کو
ہجر کو وصلت سے لذت میں سوا کہنے کو ہوں

ضبط اور جذبِ اثر کے راز کو کرتا ہوں فاش
نالۂ شبگیر کو تیغِ ادا کہنے کو ہوں

میں کہونگا خفیٰ زلیخا شرم اور تمکیں کی جاں
گوپیوں کی حرکتوں کو میں حیا کہنے کو ہوں

میں دکھاؤں گا کہ ایک اور ایک ملکر ایک ہے
دو کو لاتعداد اور بے انتہا کہنے کو ہوں

گوشِ محبت سے سن رکھو سناتا ہوں جو میں
آج میں اک قصۂ حیرت فزا کہنے کو ہوں

تم نے اتنا بھی کبھی سوچا کہ یہ کیا چیز ہے
جو ہر ارض و سما ہے عشق یا ناچیز ہے

اپنے آئینہ میں شکل یار دکھلاتا ہے عشق
اپنے جوہر میں رخ دلدار چمکاتا ہے عشق

لاکھ بھوساگر کو سکھ ساگر بنا دیتا ہے یہ
یکدلی۔ یکرنگی انسانوں میں پھیلاتا ہے عشق

تو بہ جانوں سے نہیں کرتا یہ قائم اتحاد
دل میں چنگاری عداوت کی بجھا جاتا ہے عشق

نوک پیکاں سے کبھی کھینچا نہ اپنے نقش صلح
خواہشوں کو صورتِ یار رو دھساتا ہے عشق

اسکی نسخ غیریت کی ایک خاصیت ہے اور
غیر کی آنکھوں میں اپنی شکل دکھلاتا ہے عشق

ان میں کچھ باقی نہیں رہتا تمیز و اختلاف
عاشقوں کو جامۂ معشوق پہناتا ہے عشق

دل اسی صورت پہ مٹ جائے تو ہوتا ہے یہ حال
ہر مرقع میں وہی تصویر کھینچ آتا ہے عشق

اپنے آپے کی نہیں رہتی نہیں سدھ اسلئے
لوح دل پہ دوئی کا حرف کھا جاتا ہے عشق

شخصیت عاشق کی خاکستر ہوئی جس آگ سے
سینۂ معشوق میں بھی اسکو بھڑکاتا ہے عشق

تیر جس ترکش سے آکر دل میں بیٹھا ایک کے
دوسرے کا دل اسی پیکاں سے برماتا ہے عشق

جب کوئی ہو جائے داخل عشق کے دربار میں
پھر تمیز اس کو کہاں رہتی ہے دام اور دار میں

جلوہ افگن عشق دل میں ہو تو پھر کیا چاہیئے
مرکز کون و مکاں اس دل کو کہنا چاہیئے

کوری باتیں ہیں حکیموں کی نہ ان پر جاؤ تم
عشق کیا شے ہے کسی عاشق سے پوچھا چاہیئے

یہ دیا تھا آکے اودھو نے کشن جی کو جواب[1]
تیرے بھگتوں کی گرو دیوانی رادھا چاہیئے

---

[1] کشن جی کا زمانۂ طفولیت برج کے علاقہ میں گذرا۔ پھر وہ دوارکا چلے گئے مگر برج باسیوں کے دل اسی معصوم جذبۂ محبت کا گہوارہ بنے رہے۔ محویت کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ زندگی کے معمولی اشغال تک چھوڑ بیٹھے۔ رادھا کی کیفیت امتیازی تھی۔ اودھو کشن جی کا بڑا معتقد تھا۔ مگر اسکا مسلک دوسرا تھا۔ انہوں نے اسکو بھیجا کہ برج والوں کو اس رستہ سے ہٹا دے۔

ہو کمال عشق میں کسکی طلب مطلوب کون
جائے تصویر آئینہ میں شکل زیبا چاہیئے

عاشق صادق تجسس میں پھرا کرتے نہیں
چیز جو کھوئی ہوئی ہو اسکو ڈھونڈا چاہیئے

عشق اپنے سے جو ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا
کیف اس جام محبت کا بھی دیکھا چاہیئے

آجکل سچی محبت گرچہ نادر چیز ہے
اب بھی یوسف ہیں بہت لیکن زلیخا چاہیئے

ہو محرک عشق کی خواہش تو وہ کب عشق ہے
دائرے سے عشق کے خارج تمنا چاہیئے

آب حیواں پیکے پینا چاہتے ہیں سم کا گھونٹ
موت سے قبل اہل دنیا کو مسیحا چاہیئے

ان بتوں کے عشق میں ہی تم اگر پتھر بنو
اس سے بڑھکر اور دنیا میں تمہیں کیا چاہیئے

تم سمندر میں اگر غوطہ لگا سکتے نہیں
تو کبھی اس بے بہا گوہر کو پا سکتے نہیں

عشق کے عالم میں کیا دخل اختلاف ضداد کا
ایک رتبہ ہے یہاں لیلا او اور فرہاد کا

کیا مجازی اور حقیقی ہیں یہ تفریقیں غلط
عشق عشق بے غرض ہے قول ہے استاد کا

جب نہیں احساس دکھ سکھ کا تو پر مانند ہے
اس چمن میں کام کیا ہے بلبل ناشاد کا

وصل کی خواہش ہے تو پھر وصل کے عاشق ہو تم
عشق سے کیا کام ہے اس کام کی اولاد کا

شکوہ کرتا ہے تغافل کا تو تم جانو مگر
مت اچھالو نام عشق نام و ننگ آزاد کا

توبہ توبہ عشق اور یہ شکوہ جور و جفا
عشق کیا ٹھہرا کہ ٹھہرا خنجر اک جلاد کا

اسکو ہر شے میں شبیہ یار آتی ہے نظر
ہاتھ کب تکتا ہے عاشق مانی و بہزاد کا

سالمات عنصری میں شکل یار آئے نظر
پھر دماغ اسکو کہاں ہو یا دیا فریاد کا

سلہ ہندو دیومالا میں عشق مجازی کا دیوتا۔

آئینہ میں بھی کبھی دیکھی ہے تم نے شکل غیر　　کب دل صافی میں دخل اغیار یا حُسّاد کا

گر مجسّم دل بنو آپ ہوائے عشق میں　　تو اُٹھاؤ لطف تم اس جانفزا اُفتاد کا

اس لگی کو آگ جس دل میں لگے جانے وہی

آپ کو کھویا ہے جس نے اسکو پہچانے وہی

بستوں پہ ہو گئی جبتک نہ وارد بیڑیاں　　ذات شیریں کی جدا تھی اور جدا تھا کوہکن

دم سے تیشے کے دوئی کی ہو گئی دم میں نفی　　ہو گئے یک رُوح مطلق تھے جو یکجان و دو تن

پر جو پانی میں آتے جو شنا پر نہاتے جب کبھی　　عکس اپنا اُن کو آتا تھا نظر شکل کشن

باپ لیل اُٹھاتی باندھ میں ڈونگا جان ڈال　　جب لیلیٰ موت کے بستر پہ تھا سبید حسن

کس طرح معشوق و عاشق ہو گئے یک شکل عشق　　ہیں شہادت اسکی ناک سجدہ اور آب چمن

ہم نے دیکھا بت بنا عاشق صنم کے سامنے　　آپ انسان بت ہوتا ہے کوئی برہمن

عشق صادق نفس امارہ کو کرتا ہے فنا　　عشق والاں عشق حسرت میل کا ہے کفن

عاشقوں کو زندہ جاوید کر دیتا ہے عشق　　نذر کرتے ہیں انہیں برگ تر اور رن

عشق میں معشوق اور عاشق نہیں ہوتے جدا　　ساتھ پروانوں کے یوں جلتی تھی شمع انجمن

جان دیتی ہے پھڑک کر قفس میں عندلیب　　کیسے کیسے دل مٹی میں ملتے دیکھے کہا ہے چمن

عشق شرط زندگی ہے عشق ہے شرط نجات

اس کے ہی دست پہ ہے قائم مسلسل جہانی کائنات

گُل ہے تنگ باغ چاک ہے جو دامن میں نہیں　　بلبل بیزار دام اچھا ہے گلشن میں نہیں

ایک حالت عشق میں سرو اور قمری کی ہوئی　　پاؤں کی بیڑی بنی جو طوق گردن میں نہیں

ہو گئے جو حرفِ عشق ان کے سر کے سر تاج ہیں ۔۔۔ داغ کھایا دل نے جو کب ماہِ روشن میں نہیں

ہو کھلا کے نہ کاکل کی مہک جس میں بسی ۔۔۔ پھول پتی کوئی بھی ایسی صبا بن میں نہیں

عشق کا رتبہ کہیں اعلیٰ ہے علم و جاہ سے ۔۔۔ اور فرق ابنِ صبا[1] میں اور راون میں نہیں

بجز دہی کی جس جلاتی ہے خس و خاشاک وہ ۔۔۔ دل میں پروانہ کے ہے جو آگ گلشن میں نہیں

سینۂ عشاق نے جس کو دبا رکھا نہ ہو ۔۔۔ ایسی چنگاری کوئی وادیٔ ایمن میں نہیں

جس سے ہوئے اشک ماتھے کے پسینے کو بہائے ۔۔۔ اتنی طاقت بھی تمہیں ہے برقِ خرمن میں نہیں

عشقِ خالص ہو گیا ہو جس کے دل میں جلوہ گر ۔۔۔ امتیاز اس کے لئے شیخ و برہمن میں نہیں

دیر و کعبہ کیا ہے ہر ذرہ میں عکسِ روئے دوست ۔۔۔ فرق چشمِ عشق میں مسکن سے مسکن میں نہیں

حُسن سے گر عالمِ تکوین نے پائی ہے شان
عشق نے پھونکی ہے اس میں رُوح اسکے تن میں جان

دیکھتے ہو باغ میں یہ گل یہ نرگس یہ چنار ۔۔۔ تو ہیں یاد آتے رُخِ رنگیں و چشم و دستِ یار

قامتِ دلدار کھنچ جاتا ہے آنکھوں میں تری ۔۔۔ دیکھو تم سروِ سہی کو جب کنارِ جوئبار

کھینچتی ہے نقش آنکھوں میں خرامِ ناز کا ۔۔۔ اپنی اٹھکیلی کی چالوں سے تذروِ کوہسار

تم الجھ جاتے ہو سنبل سے بس اتنی بات پر ۔۔۔ رکھتا ہے قدرے وہ شکلِ گیسوانِ تابدار

دیکھا غنچہ دہانِ یار کی آتی ہے یاد ۔۔۔ کرتے ہو موتی کبھی اک سلکِ دنداں پر نثار

گرچہ پی تھی تمہارے سر کو دُردِ جامِ عشق ۔۔۔ تو تمہیں یکساں تھے گلزار اور دشتِ خارزار

یاد آنا ایک شئے کا بھولنے کا ہے ثبوت ۔۔۔ دھیان آنا ہے فراموشی کو کرتا استوار

[1] ابنِ صبا ہنومان کی کنیت ہے۔

ایڑسے میں عشق کے آتے تو تمکو ایک تھے — گیسوئے معشوق اور یہ عنبر و مشک تتار

مجازی یا حقیقی شرط نسخِ ذات ہے — ہے فنائی ذات پر ہی عشق کا دار و مدار

ایک کو دو دیکھنا ہے چشمِ احول کا خواص — ہے دوئی اور غیریت سے دیدۂ بینا کو عار

اپنے آپے پر کھلا عاشق کی جب جاتے نظر

ماسوا کون و مکاں ہیں سب نہیں آتے نظر

دل گیا مٹی میں جو دل عالم آرا ہو گیا — عرش کی آنکھوں کا طفل اشک تارا ہو گیا

خودکشی ہے عشقِ صادق میں مسیحائی کی شرط — اپنا دشمن جو ہوا خلقت کا پیارا ہو گیا

پھر کہاں تم اور کہاں دیر و حرم کے سنگ و خشت — دل میں جب عشقِ حقیقی جلوہ آرا ہو گیا

گھاٹ اس تلوار کے اترا جو عاشق تر گیا — دھار تیغِ عشق کی گنگا کا دھارا ہو گیا

قعر میں بحرِ محبت کے ہوا جو تہ نشیں — ساحلِ امید سے اسکو کنارا ہو گیا

آشنایانِ محیطِ عشق کو اس سے غرض — تشنۂ ساحل کو کوثر کا سہارا ہو گیا

من کو مارو تو خدا جانے وہ کیا سے کیا بنے — دیکھ لو اکسیر خالص مر کے پارا ہو گیا

بیم اور امید کی باقی نہیں رہتی لگن — جس کے دل میں عشق کا روشن شرارا ہو گیا

ہو گیا عشقِ مجازی میں بھی حاصل جب کمال — تو وصال و ہجر بھی یکساں گوارا ہو گیا

تخت پر عشقِ حقیقی کے ہوا جو جلوہ گر — اس کے سایہ سے جہاں پر نور سارا ہو گیا

اس کے آگے اور ہیں تم کو بتا سکتا نہیں

اور بتاؤں تو سمجھ میں ہرگز آ سکتا نہیں

اے صمدی تمہیں اتنی تجھے فرصت کہاں — جو سنے عشق و محبت کی تو مجھ سے داستاں

تیرے مکتب میں طفلِ مکتب ہیں شبیٹ اور بالمیک
نورِ باطن سے ہوا جن کے منوّر کل جہاں

قیس سودائی ہے اور فرہاد تیشہ چھوڑ رہے
ہیر کا جیون ترے آگے ہے بس تڑپن کا بیاں

تیرا فتویٰ ہے کہ افسانہ ہے جنگِ کربلا
ہے کشش لیلیٰ پہ تجھ کو الف لیلہ کا گماں

قول ہے تیرا کہ ہے منصور ہو لو د خیال
شاعروں کی ہیں یہ پہلا وادور دھر دنوش کہانیاں

شان ہے تجھ کو جو کہہ دے ہاں مگر اپنی بہ نیت
ایک ٹی نیا کی تو ارتیخوں کو جھجکیگی کہاں

عشق سے کیا آئینے کو اپنے دوامی دی جلا
جو چِتا سے قلعۂ چیتوڑ کی اُٹھا دھواں

غازۂ رخِ محبت ہے جہاں آرا کا عشق
تار کنڈی کا نہیں جس سے پدر کی بیڑیاں

تھی ہار دل میں شکست اور تھی جنید اول ظفریاب
عاشقِ اسلام کا کوفہ جو پہنچا کارواں

نقطۂ تکمیل پر پہلا دکا پہنچا جو عشق
منظرِ نورِ حقیقت ہو گیا سارا امکاں

سر بسر ہے عشق بے لوث اور محبت بغیرض
تو لگی رہ کام میں اپنے تجھے اس سے غرض

یہ نظم ۳ر دسمبر ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے اور ادیب الہ آباد و کمال دہلی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا تمہیدی بند اس مفہوم کا ہے۔ کہ اساتذہ متقدمین کے اچھے سے اچھے قصیدہ کی تشبیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ موضوع یہ ہے کہ انسان تزکیہ نفس اور اپنے ذات کے علم میں ہی ترقی کرتے کرتے منزل مقصود پر پہونچ جاتا ہے۔ (زہیر)

ہے دل میں انجمن کو آج رشکِ گلستاں کردوں ۔۔۔ دہانِ غنچہ سے رازِ دلِ بلبل بیاں کردوں

صریرِ خامہ سے ایسا جگاؤں آج میں جادو ۔۔۔ کہ ہر برگِ شجر سے دفترِ معنی عیاں کردوں

شبیہِ غنچۂ سربستہ معنی وہ کھینچوں میں ۔۔۔ کہ حیرت سے قلم مانی کا انگشت دہاں کردوں

عروسانِ چمن کو سبزے سے بخشوں ہم آغوشی ۔۔۔ کروں وا چشمِ نرگس بند سوسن کی زباں کردوں

چکوروں کی لگن بہلاؤں داغ دلمیں چاند کے ڈالوں ۔۔۔ گدازِ شمع سے میں سوزِ پروانہ عیاں کردوں

پنہاؤں گردنِ سروِ سہی میں طوقِ قمری کا ۔۔۔ دہن میں غنچہ کے پیدا عنادل کی زباں کردوں

دمِ بادِ صبا میں گھنگرو سی ہوں پیچ سنبل کے ۔۔۔ تبسم میں کلی کی بند بلبل کی فغاں کردوں

تدروں کے خرامِ ناز میں بجلیاں بھر دوں ۔۔۔ کہ دامن چادرِ مہتاب کا مثلِ کتاں کردوں

سمن کے سینۂ صافی میں چھپاؤں داغ لالہ کا ۔۔۔ رگ گل سے مرتب بلبلوں کا آشیاں کردوں

بھروں وہ حسن شام کی مرلی کی کوئل کے ترنم میں ۔۔۔ چیستان چمن کو بیخودی میں گو بیاں کردوں

نظر کی حد مٹا کر اسکو لا محدود کر دوں میں ۔۔۔ نمایاں اس میں پیدا پر اک نوکھا آسماں کردوں

اُٹھاؤں سر بسر نیرنگئ عالم کے پردے کو ۔۔۔ شفق کو داغِ قلب شاہِ خاور کا دھواں کردوں

میں کردوں بند اک کوزے میں ان گنت سمندر کو ۔۔۔ حبابوں سے میں چھوٹے سے شعر کا چشمہ رواں کردوں

چڑھاؤں خود فراموشی کا ایسا رنگ محفل پہ ۔۔۔ یہاں گر زاہد خشک آئے تو پیر مغاں کردوں

مٹا کر عالم احداث سے وہمی کرشموں کو ۔۔۔ تمہارے واسطے تیار اک تازہ جہاں کردوں

چراغ طور سے فانوس اُٹھے لن ترانی کا ۔۔۔ مثال مہر طشت از بام راز کن فکاں کردوں

وہ کھینچوں شاہد معنی کی رنگا رنگ تصویریں ۔۔۔ کہ بے رنگ اُنکے آگے رنگ نیرنگ زماں کردوں

لگا دوں چار چاند اس نظم کو نورِ مضامیں سے
جبین کہکشاں کو رنگ دوں کلکِ نگاریں سے

تماشا آؤ دکھلاؤں تمہیں باغِ معانی کا ۔۔۔ جہاں کانٹے کو حق حاصل ہے گل کی دلستانی کا

یہ ہے وہ باغ صدقے جسکے ہے سو جان سے رضواں ۔۔۔ ہے فخر اندر کا رتبہ جسکے در کی پاسبانی کا

صبا ہے پانو دھو کر آب حیواں سے جہاں جاتی ۔۔۔ ملک چھڑکاؤ کرتے ہیں جہاں کوثر کے پانی کا

تمایز قمری و بلبل میں یاں فرق شخصیت گم ہے ۔۔۔ نشاں پایا ہے رتبے مثل عنقا بے نشانی کا

برستے ہیں جہاں شبنم سے موتی خندۂ گل پہ ۔۔۔ چٹکتی ہے کلی تو قہقہہ ہے شادمانی کا

خزاں سے مثل سرو آزاد گل بوٹے یہاں کے ہیں ۔۔۔ کہ ناممکن ہے دخل اس باغ میں فصل خزانی کا

وہاں سبزے کی چادر آنکھوں میں فرط شادابی سے ۔۔۔ وہاں ہے بحر عرفاں بلبلہ ہر ایک پانی کا

ہے اس کا پتّا پتّا اہل دل کو دفتر معنی — ہے اس کا غنچہ غنچہ آئینہ راز نہانی کا

زباں منہ بیچ ہے وہاں سوسن و نرگس ششدر و حیراں — وہاں عذر جہالت ہے نہ دعویٰ رازدانی کا

کھلیں گل جو پڑے شاخِ شجر کا سایہ پانی میں — یہ عالم نامیہ کی ہے وہاں لبیّنہ دوانی کا

ریاضِ روح پرور میں ہے عنقا بلبلِ نالاں — خوشی کا راگ گانا آج یہ ہے کام بانی کا

وہاں لالہ کے دل میں شورِ والشمس[1] لکھا ہے — چٹکتا ہے جو غنچہ نغمہ اٹھتا ہے اپانی[2] کا

نظر کے طائرِ طرار کی جلتے ہیں پر اس جا — زمیں سے اس کی نسبت پست بامِ آسمانی کا

رسائی طائرِ علم و حکم کی کب وہاں تک ہو — فضا میں اس کی کب ہے دخل مرغِ لامکانی کا

پہنچ بیٹھ خیالِ پاشکستہ کی نہیں اس تک — نہیں کام اس سوادِ پاک میں کچھ نکتہ دانی کا

فروغِ آتشِ گل میں ہے گم مشہود و شاہد بھی — گل و بلبل پہ ذکر اس جا نہیں کچھ لن ترانی کا

نظارہ ہے جمالِ روحِ گل کا ذرے تکتے ہیں — کفِ خاکِ چمن نسخہ ہے اکسیرِ معانی کا

ترا دل ہی تو ہے وہ باغ جس کی چھب انوکھی ہے
یہ بیلا ہے - یہ چمپا - دیکھ یہ جوہی چنبیلی ہے

طلب سچی خوشی کی ہے تو اس گلزار میں آ کر — رگِ گل میں تو موجِ بحرِ عرفاں کا تماشا کر

یہ باغِ دل ہے - اس میں ہے گل عشقِ حقیقی کا — نظارہ اس کا جب ہو پہلے پال چشم بینا کر

پھنسا ہے تو تو یار اور زنجیرِ کفر و دیں جھگڑے میں — تو لے کھوتے ہیں تجھے گھر کے وہاں دیکھیگا کیا جا کر

دوئی اور غیریت سے تو سدا تکلیف پائیگا — کسی کا ہو کے رہ یا تو کسی کو یار اپنا کر

نہیں یا دل سے تیرہی انت بجلی نکلتی ہے — جو دوڑا ہے تو پھر برق خرمن مست اٹھا کر

[1] قرآن کی ایک سورۃ — [2] وید کی ایک آیت جو اُپانی یا دھوٹا سے شروع ہوتی ہے

جو ڈھونڈھتے ہے نہیں ملتا وہ ملجاتا ہے بیٹھے میں
تو مرتے جاگتے محویت کامل کو پیدا کر

کسی شے سے نہ فعل فطرتی ساقط کبھی ہوگا
یہی دانائی ہے کام اس سے لے فانو ہیں تو لا کر

بصیرت کی طلب ہو تو نہ رکھ تو چشم نظارہ
اگر ہے دید کی خواہش تو لاشے کو تماشا کر

مثال ہے گر کسی صورت پہ تصویر اسکی بن جا تو
اگر محو خودی ہے آپ کو ہر شے میں دیکھا کر

پھنساتے دل کسی بت سے اگر گیسوئے پُرخم میا
تو شکل میں بھی لٹ یار کی پیچوں کو سلجھا کر

سما جا اس میں جا کر تو اگر ہے الست تجھ میں
تغافل کا نگاہ ناز کی ہرگز نہ شکوا کر

جو ہے بازیچہ وہم وگماں کا محو نظارہ
تو چشم نرگس حیراں سے ہر شئی کو دیکھا کر

نہیں گر تاب ہجراں کی تو خواہش وصل کی مت کر
جو ہاتھ آکر نکلجائے کبھی اسکا نہ پیچھا کر

انانیت نہ ہو تجھ میں تو کیا دعوٰی ہے کار تمہید دل کا
جو ہے منظور یار اپنا تو غیروں کو اپنا کر

نہوگی آس ٹوٹ یاس کا کب غالب آئیگا
تمنا وصل کی ہوگی تو چھا جائیگا ہجر آکر

یہی ہے خود پرستی آپ کو ہر شکل میں دیکھے
یہی ہے دیکھنا اے دیدہ ور کچھ بھی نہ دیکھا کر

یہ کہدینا تو ہے اک بات میں - تو دو نہیں اتنا
تصور اور عمل میں اپنے تو یہ رنگ پیدا کر

کریگا صاف لوح دل تو وہ نقش اس میں پائیگا
کہ ساری ذہن کی مفروض شکلیں بھول جائیگا

وہ دل کو دل سے کھودیتی ہے وحدت ایسی ہوتی ہے
نظر آتا ہے غیر اپنا محبت ایسی ہوتی ہے

تمیز زلف و عارض خال و ابرو کچھ نہیں رہتی
فروغ حسن کی تاثیر و برکت ایسی ہوتی ہے

نظر آتا ہے نور روئے جاناں اسکو ہر شے میں
نگاہ محو نظارہ کی حیرت ایسی ہوتی ہے

تو جن کے لوٹتے فکر اور فعل ان کا مبرا ہے
جو از خود رفتہ ہیں ان میں لطافت ایسی ہوتی ہے

رقابت اور غیرت کا بوجھ اس سے نہیں اٹھتا — خیالِ حسنِ جاناں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے

نظر معشوق آتا ہے جو آنکھ اپنے پہ پڑتی ہے — کمالِ عشق میں عاشق کی صورت ایسی ہوتی ہے

اسے تارِ نفس تارِ گریباں کے برابر ہے — جنونِ عشق میں عاشق کی وحشت ایسی ہوتی ہے

ہجومِ کثرتِ عالم میں رہ کر ہیں الگ اس سے — یہ ہوتے ہیں موحد اور وحدت ایسی ہوتی ہے

خبر رکھتے ہیں کل کی آپ سے وہ بے خبر ہو کر — نشے عرفاں کے مستوں کی غفلت ایسی ہوتی ہے

پیے اک جام جو اسکا وہی اسکا مزا جانے — بتاؤں کیا تجھے اس مے کی لذت ایسی ہوتی ہے

خبر کیا میری تیری۔ اپنی سدھ تک بھی نہیں رہتی — جب انہد باج بجتا ہے تو حالت ایسی ہوتی ہے

نہ دل ہو طالبِ وصل اور نہ شوقِ دید تجھکو ہو — اسی کو عشق کہتے ہیں محبت ایسی ہوتی ہے

جو جانا اور سیکھا لوحِ دل سے پاک قلم دھو دے — یہی ہے علم کامل اور حکمت ایسی ہوتی ہے

خزف ہے اسکے آگے لعلِ نورِ تاجِ سلطانی — متاعِ درد کی دُر اور قیمت ایسی ہوتی ہے

اگر ہو جائے تارا آفتاب اس تک پہنچتا ہے؟ — خیالِ بیخودی کی شانِ رفعت ایسی ہوتی ہے

پڑا ہے یہ ترا سارا جہاں اک بیچ کونے میں — مکانِ دل کی پہنائی و وسعت ایسی ہوتی ہے

شمیمِ گیسوئے حورانِ جنت سے ہے غنی کرتی — نسیمِ بوستانِ دل کی نکہت ایسی ہوتی ہے

اگر اس باغِ دل کا تو بھی محوِ تماشا ہو
تو عالمِ ذات حاصل کر کے خود اپنے پہ شیدا ہو

اس نظم کا اقتباس رسالہ مخزن میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کا خیر مقدم کرتے علم و فن کی کساد بازاری پر آنسو بہاتا ہے۔ ستمبر ۱۹۰۹ء میں جناب مولوی غلام قادر گرامی صاحب ہی رخصت لیکر حیدرآباد سے اپنے وطن جالندھر میں تشریف لائے۔ اس موقع پر ایک عام جلسہ خیر مقدم میں یہ نظم پڑھی گئی۔ اس جلسہ کے بانی بھی پنڈت صاحب ہی تھے (مدیر)

—— :o: ——

فرش رہ آنکھیں ہیں سب کی اے عزیز دوستاں ۔۔۔ ذات پر تیری ہے نازاں آج کل ہندوستاں

اے گرامی گھر میں پھر آنا مبارک ہو تجھے ۔۔۔ ہے وطن سے یہ محبت تیری عظمت کا نشاں

قصبۂ گنجوہ کو بخشا غنیمت نے جو فخر ۔۔۔ اس سے اونچا آج جالندھر کا ہے نام و نشاں

تخت پر تھا مصر کے پر دل میں تھا کنعاں کا عشق ۔۔۔ تیرے دل میں ہے سوا یوسف سے حب دوستاں

کب بدخشاں سے نکل کر لعل نے لی بازگشت ۔۔۔ بوئے گل کا باغ سے جا کر نہ لوٹا کارواں

مشک یوں تاتار سے نکلا کہ قیدی قید سے ۔۔۔ بزم سے جا کر نہ آیا عود کا واپس دھواں

لیکن اپنے مولد و منشا سے تجھکو ہے جو عشق ۔۔۔ قالب حب وطن کی ہے وہی روح رواں

انتخاب ہفت کشور گرچہ یہ پنجاب ہے

چار چاند اس کو لگے ہیں تجھ سے ہی آکے یہ

اے دیار ہند ای شعر او حکمت کی زمیں ۔۔۔ آ کہ پیارے وطن نے روکش خلد بریں

بیکے اوصاف اپنے علی اور ہیں نادر مثال — بھولنا چاہیں بھی ہم تو بھول انہیں سکتے نہیں

کیشو، تلسی، سور اور کالی کو رہنے دیجیے — جن کو آنکھوں پہ بٹھاتی ہے صدی بیسویں

وہ زباں اپنی نہ تھی۔ اُس میں جو سخن کی داد دی — مستحق وہ اس قدر توصیف کی شاید نہیں

فارسی میں ہو گئے لیکن یہاں جو باکمال — نغمہ سنج اُن کی ثنا میں بلبلان پارس ہیں

خسرو، فیضی۔ اور غنی، بیدل، غنیمت اور ظہیر — ان کی سحر آہنگیاں مفتون عجم کو کر گئیں

حسرتی۔ آزردہ، صہبائی و نیر اور قتیل — مایۂ ناز قدیماں تھے یہ سب مستثنیٰ ہیں

اور وہ شیر بیشۂ نازک خیالی واد ب — میرزا غالب زباں جس نے سب کی بند کیں

اہل ایراں نے اگر اُن کے آگے مارا دم نہیں
تو کسی سے آج یہ نامی گرامی کم نہیں

تو سپہر نغز گفتاری کا ہے مہر منیر — مطلع خورشید معنی ہے ترا روشن ضمیر

روح جامی و نظامی مست تیرے شعر پر — دام الفت میں تری فردوسی صاحب اسیر

گر ظہیری و قاآنی کا پڑھتا ہیں کلام — تو نہ اکثر پائیں گے تیری بلاغت کی نظیر

جھومتا ہے مست ہو کر بلبل شیراز بھی — طوطیٔ ہندوستاں کی سن کے یہ دلکش صفیر

تجھ سے کسب نور کرتا انوری ہوتا اگر — تو سپہر باکمال کا ہے وہ مہر منیر

ہے غلام قادر مطلق دل و جاں سے جو تو — یہ ملا قادر کلامی کا بھی تجھ کو سر پر

ہے فصاحت اور رنگینی میں گر یکتا کلام — تو نزاکت اور لطافت میں مضامیں بے نظیر

؎ کیشو، تلسی داس، اور سور داس، یہ تینوں ہندی کے۔ اور کالی داس سنسکرت کے مشہور شاعر ہیں۔

فکرِ عالی اس بلندی پر پہنچتی ہے تری — جس کے آگے اہلِ ایراں کی بھی ہے ہمت قصیر

اب کہاں یہ رنگ نیشاپور اور شیراز میں
اب نہیں شوخی صفاہاں کے بتِ طناز میں

ہے ترا دیوان گلزارِ دل آرائی کا باب — ہے ترا اک ایک شعر اک نکتہ پرور انتخاب
تجھکو آنکھوں پہ بٹھائیں مردمِ اہلِ نظر — ہے ہر اک مصرعہ ترا ابروئے جاناں کا جواب
مطلعِ خورشیدِ معنی مطلعِ روشن ترا — اہلِ دل جس سے کریں نورِ دروں کا اکتساب
خالِ رخسارِ فصاحت نقطۂ مشکیں ترا — غازۂ روئے اثر تیرے سخن کی آب تاب
گر غزل ہے تو نظیری اور حافظ کا بدل — گر قصیدہ ہے تو خاقانی و عرفی کا جواب
مثنوی ہے تو ظہوری اور جامی سے بجل — سر پٹکتا ہے روانی دیکھکر جس کی چناب
گرم جولاں توسنِ خامہ اگر ہو رزم میں — تھامیں فردوسی نظامی دوڑ کر تیری رکاب
کلکِ گوہربار تیری ہو جو زینت بخشِ بزم — اشکِ حسرت چشمِ نیساں میں بنے دُرِ خوش آب
جس زمیں میں لکھدئے تو نے کبھی دو چار شعر — ہوگئی وہ چرخِ ہفتم سے سوا عالیجناب
لکھدیا اپنے کیا تیرا عجم میں جب کلام — آیتِ شعرت بدوں نسخ چوں ام الکتاب

تر زبان بزمِ سخن میں جب گرامی ہوگئے
سمجھے سب پھر زندہ جامی و نظامی ہوگئے

آجکل بدلا ہوا ہے بیطرح رنگِ زمن — اختراعِ فرنگ کا شیدا ہوا چرخِ کہن
خیرہ میں آنکھیں تو چھائی سر میں بجلی خیرگی — لیمپ نے بجلی کے ٹھنڈی کردی شمعِ انجمن
کام کی باتیں نہ اگلوں میں ہیں ساقی کیونکہ بات — ہر بشر پر چاشنی تھا ہم سے جو چرخِ پُر فتن

وضع نہ بدلے کیوں نو آہنگوں کی اب اس نظم میں
چنگ و بربط و بین کی جا ہیں پیانو، آرگن

آنکھ سے بدلی ہوئی نرگس کی سوسن کی زباں
بولتے ہیں بولی ٹھٹھولی اب نئی مرغِ چمن

دفترِ پیشیں کا اب تقویم پارینہ خطاب
معرضِ تغییر میں ہے اس قدر اپنا وطن

چاہیئے تھا ہم سوتے گرم و سردِ شرق و غرب
اعتدال طبع کی ترتیب کا کرتے جتن

کون کہتا ہے علومِ نو سے ہو بیگانگی
پر مٹاتے ہو جہاں سے کیوں قدیمی علم و فن

کیا عجب ہو جائے گر پچھم کا جادو کارگر
ایشیا کی اب برف برسے قطب کے مینار پر

کیا سلف میں خوبیاں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
صفحۂ تاریخ پر ہاں کچھ نمایاں ہو گئیں

اب نہیں آتی کسی کو انکی بو سے بھی یاد
سب وہ انکی صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

وہ فضائل اب کہاں ہیں ہند کی تہذیب میں
جن پہ مشرق و مغرب کی اقوام قرباں ہو گئیں

اب ہے باقی ادیب اگلے نہ وہ علم و ادب
صورتیں اب انکی نقشِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

چرخِ کج رفتار کیا طبقہ دیا تونے الٹ
تیری چالیں گردشِ چشمِ حسیناں ہو گئیں

دین جن کا شعر تھا اور جن کا مذہب تھا ادب
نیتیں انکی بھی اب رندوں کا ایماں ہو گئیں

سوز ہو دل میں تو ہو آہ و فغاں میں بھی اثر
آہیں دل کی اب چراغِ زیرِ داماں ہو گئیں

روشنی نے غرب کی سر اور خیرہ کر دیا
برکتیں ہم تک جو پہنچیں فتنہ ساماں ہو گئیں

جو پڑا عقدہ گرہ بند قبا کی بن گیا
گتھیاں جو کھل گئیں زلفِ پریشاں ہو گئیں

اختری ہر زندگی کی شق میں ہے پھیلی ہوئی
شاعری بھی حیف اسکی صید اب ہونے لگی

گر یہی نغمہ کا شیدا جہاں ہو جائیگا — اب سے دور اک دن قیامت کا سماں ہو جائیگا

گر یہی چولا بدلنے کا اسے پیکار ہا — تو برہنہ ایک دن ہندوستاں ہو جائیگا

یہ ہوا ہے باغ کی تو شاہد گل ایک دن — سبزہ کی مانند بیگانہ یہاں ہو جائیگا

نرگس و سنبل صنوبر ہونگے سب وقف خزاں — لان ٹنیس کی جگہ یہ گلستاں ہو جائیگا

اب گراموفون میں گونجیگی غنچوں کی چٹک — باغ پر احسان صبا کا رائیگاں ہو جائیگا

چار آنکھیں کیسی اب کس سے ہونگی باغ میں — کون بوسن سے چمن میں ہمزباں ہو جائیگا

خندۂ گل کی ادا پر لوٹ ہوگا کس کا جی — بلبلوں سے کون اب ہمداستاں ہو جائیگا

ہے نوا سنج آجکل بس تو گرامی کو کہ پھر — نغمۂ بلبل سے خالی بوستاں ہو جائیگا

سنتے ہیں اک تازہ لٹریچر بنا ہونے کو ہے
دیکھتے ہیں ہم کہ یہ فن ہی فنا ہونیکو ہے

گرچہ اکبر او رچند[1] ہے نہ فیضی اب نہ چند — نغمہ سنجان کہن پھر بھی غنیمت ہیں جو چند

اوران کا ای گرامی قدر تو سرتاج ہے — بلکہ اگلوں کے ہے رتبے سے ترا رتبہ بلند

گر ظہیر اور داغ نے دہلی کی بخشی آن شان — ذات تیری کن ہے رشک شیراز و خجند

تو نے پایا ہے نصیبوں سے مربی وہ خدیو — جسکی ہمت پہنچی ہے چرخ ہفتم پر کمند

اعلیحضرت آصف جم شوکت افلاطوں خرد — ہے جہانداری میں جسکا نام عالم میں بلند

اسکی ہے جوہر شناسی خوش مذاقی کا ثبوت — مشورے کے واسطے جو کر لیا تجھ کو پسند

بخشتا ہے حیدرآباد اس کو امن اور پناہ — ہند میں ہوتا ہے جس ذی علم پر دروازہ بند

[1] چند - پورا نام چند بردئی - راجہ پتھورا کے دربار کا ملک الشعرا

گر نہ حضرت کی مدد ہوتی تو کر دیتا فنا — مشرقی علم و ادب کو کس مپرسی کا گزند

کیوں نہ ہو گل ہند میں بے مثل دربار دکن
گوہر شہوار پنجاب اس کا ہے رخشاں رتن

اے ز فن شعر غوغا در جہاں انداختہ — جان تازہ در دل مردہ دلاں انداختہ
چوں شنید آوازۂ جاں بخشیٔ گفتار تو — ابن مریم رخت خود بہ آسماں انداختہ
چاک در دامان گل سوز نوایت در فگند — بلبلاں را نغمہ ات اندر فغاں انداختہ
طبع مواج تو در اقلیم معنی پروری — رشک شہرت در دل آب رواں انداختہ
توسن فکر بلندت معنی وحشی نژاد — پیش تو آرد بہ گردن ریسماں انداختہ
ہند را سرمایۂ ناز است ذات پاک تو — او کلاہ فخری بر آسماں انداختہ
سکۂ نظم تو از پنجاب تا ملک دکن — شاعری آوازہ ات در اصفہاں انداختہ
نے ہمیں نازد بہ ذاتت کشور ہندوستاں — بل سپر پیش تو ملک شیرواں انداختہ
بلبلاں را زینت آئین غزل خوانی زیاد — تا گرامی طبع تو طرح بیاں انداختہ
بود نظم فارسی در ہند چوں شمع سحر — گشت تو در قالبش تازہ رواں انداختہ
تا بہ اوج فکر والایت رسد پیک خیال — قدرت حق آسماں بر آسماں انداختہ

ہے دعا کیفی کی تجھ پر لطف حق دائم رہے
تو جہاں میں - شعر میں تیرے اثر قائم رہے

ظہورِ انسان

یہ ایک طویل مثنوی کی تمہید ہے۔ جو رسالہ انسان امرتسر کے لئے ۱۴؍ اپریل ۱۹۱۲ء کو لکھی گئی۔ یہ نظم کسی تقریب کی محتاج نہیں۔ (مرتبہ)

جب اس عالم کی تکوین اور پیدائش کا وقت آیا
تو سب سے پہلے نور اس مہر عالمتاب نے پایا

حرارت اور کشش اس درجہ اس خورشید نے پائی
کہ جو شے تھی وہ اسکی جانب آپ سے کھنچ آئی

محیط دہر کے عنصر ہوئے قربان سب اس پر
طواف اسکی کرنے لگے گرد اسکے کھنچ کھنچ کر

ستارا مہر عالمتاب کا آفاق میں چمکا تو
بنا وہ محیط قدرت میں مرکز سارے عالم کا

بخار اور کثافات اسکے اڑ سب جانب تقسیم کر
جما دی بستگی نے آگ اور پانی تک بھی جم جم کر

جو سیالی تھے سیالات ان کو ضبط میں لا کے
عطا کی کیمیائی عنصروں کو شکل ارض اس نے

نظام شمس سے اندر گئی جب یہ زمین جکڑی
تو پھر نشو و نما کی مادے نے شکل اک پکڑی

طبیعت میں بھری تھیں شوخیاں اور چلبلاہٹ تھی
غضب کی برق وش تھی اور چنچل تھی قیامت کی

بہت مدت سے قدرت نے اسکے حال پہ چھوڑا
مگر بیٹی سے ماں نے رشتۂ الفت نہیں توڑا

اسے بھی رفتہ رفتہ اپنے دن بن کا خیال آیا
مزاج اسکا ذرا ٹھہرا طبیعت نے سکوں پایا

ہوئی خواہش اسے جب اپنے تن کی پردہ پوشی کی
بنی پوشاک اسکی گھاس پات اور جڑی بوٹی

یہ تو پیدا ہر چند ہو بھی رہی جب آگ پر اوڑھی — تو پھر جنگل کی چادر اپنے سر سے پانو تک اوڑھی

مگر پھل پھول جو اسکے تھے ضائع کیسے ہو جاتے — نہ کیوں حیوان اس سے استفادہ کو جنم پاتے

جو تخییل ذرا سوچے تو یہ بھی کیسی حالت تھی — تصور میں کچھ آسکتی ہے خلقت کی جو صورت تھی

بھری تھی نکہت اول جب اس غنچہ میں اور گل میں — تحمل صبا وہ تھا کوئی نہ جب گلگشت بلبل میں

چکوروں کو ہمیشہ چاند سے جب وصل رہتا تھا — قفس میں گل سے بلبل کو نہ ہرگز فصل رہتا تھا

جو پروانوں کو تھی تو حسن خالق کی لگن ہی تھی — نہ تھی جب شمع ہی جلتی نہ کوئی انجمن ہی تھی

ندی کے راگ میں تھی موہنی کی دھن بھری رہتی — بلا تغیر وقت اور مدت کے وہ رہتا سدا ہی جاری

ہوا دن رات صرف دیتی اسے اور اسکا دم بھرتی — جہاں جاتی وہ اسکا راگ گاتی اور ثنا کرتی

زمیں پر پھول پھل اوپر یہ مہر و ماہ اور تارے — غرض کہ دنیا کو روشن کر رہے تھے ملکے یہ سارے

جو سنگھ اور ہیش میں آفاق پر اک ربط باہم تھا — زمیں پر شیر اور بکری میں بھی کیا پیار کچھ کم تھا

مگر تکوین عالم نے نہ پائی اس پہ بھی تسکیں — یہ پیدا کرکے سب کچھ بھی نہ عالم کی ہوئی تزئیں

جھلکتا پھر رہا تھا جوہر قدسی عناصر میں — سمایا تھا نہ نور پاک عالم کے مناظر میں

کمی یہ سلسلہ میں ارتقا کے جب نظر آئی
تو پھر تکمیل نے فطرت کی شکل انسان کی پائی

طلوعِ سحر

یہ نظم جو ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء کو لکھی گئی۔ رسالہ مخزن دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ نواب حیدر یار جنگ علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے رسالہ کہکشاں جنوری سنہ ۱۹۱۹ء میں ادب آموز کے نام سے اس پر متعدد اعتراضات کیے جن کا جواب شافی رسالہ مخزن بابت جون سنہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تو ہر دو باکمالوں کی یگانگت اور محبت کا باعث ہوا۔ دیکھیے ستائش کو کیا تغزل کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ ہے قادر الکلامی کا کمال۔ اس نظم کا ایک شعر یہ ہے ؎

منہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھو دیے تھے — سنبل کے بال بال میں موتی پرو دیے تھے

اتفاق سے میر انیس کے حسبِ ذیل شعر سے کسی قدر ٹکرا گیا ہے ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

(مدیر)

تھا دور ابھی منزلِ لشکرِ سحر — سرہنگِ شب نے بھانپ کے دنیا کو دی خبر

شبنم کے قافلے آئے غباروں میں چھپ کر — اُن سے صبا نے سُن کے خبر کی وہ مشتہر

سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ہے کس کا انتظار؟

جو رایتِ شفق ہوا مشرق سے آشکار

آ کر جو کی نسیم نے شوخی سے گدگدی — تو ہر کلی کی آنکھ مہیں سے کھل گئی

بلبل کی جانب اس نے جو چپکے نگاہ کی — کچھ دیکھ کر اِدھر اُدھر اک بار ہنس پڑی

تھی تاک میں شمیم وہیں پر لگی ہوئی

اُس کی بدولت اس کی چمن میں ہنسی اُڑی

چپکے سے کیا نسیمِ سحر نے سُنا دیا — غنچوں کے دل کو فرطِ طرب سے کھلا دیا!

بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا — شبنم کے چھینٹے دیکے چمن کو جگا دیا

غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے

انگڑائی لیکے سرو و صنوبر ہوئے کھڑے

رنگِ شفق سے تھا جو افق ملک زرنگار — یکمشت گل نے بیعنہ زر کر دیا نثار

دلکش عروسِ باغ کا تھا حسن اور نکھار — صدقہ ہزار جان سے تھی عندلیب زار

منہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے

سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

چھایا ہوا تھا دہر میں اک نور کا سماں — دھویا ہوا تھا آبِ رخِ حور سے جہاں

انجم کا آسماں سے کھسکا تھا کارواں — مہتاب کے بھی منہ پہ اڑی تھیں ہوائیاں

شب زندہ دارِ چرخ کا بھی رنگ فق ہوا

غالب ہر ایک رنگ پہ رنگِ شفق ہوا

نکلا جو خیمہ سے شہِ گیتی ستانِ صبح — حاضر پئے سلام ہوئے افسرانِ صبح

فوجِ شعاع لیکے بڑھا قہرمانِ صبح — لہرا رہا تھا پیلِ فلک پر نشانِ صبح

ڈنکا ہوا طیورِ چمن کی صفیر کا ÷

اک غل تھا آمدِ شہِ گردوں سریر کا

فوجِ شعاع کی آمد کی جب یہ دھوم ÷ — تو چھپ گیا فلک سے ہوا لشکرِ نجوم

مشرق میں یوں ہوا شہِ خاور کا جب قدوم — آنکھوں پہ رکھے سب نے قدم اس کے چوم چوم

اکدم میں شب کی تیرگی کافور ہو گئی ÷

دنیا چمک کے اک کرۂ نور ہو گئی ÷

نیا زمانہ

یہ نظم ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو کہی گئی اور مخزن میں شائع ہوئی

(مدیر)

پیدا ہوئے ہیں دشمنِ ایماں نئے نئے
ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے

ویدوں پہ تازہ تازہ چڑھاتے ہیں حاشئے
گھڑتے ہیں لوگ معنیٔ قرآں نئے نئے

انساں تو کیا خدا کے بھی سجدے سے عار ہے
ہیں چودھویں صدی کے یہ شیطاں نئے نئے

کوثر کے اب خیال میں کچھ بھی مزا نہیں
چشمے نکالے خلد میں رضواں نئے نئے

سالوس وہمی۔ اور جنونی ہیں اُن کے نام
بندھتے ہیں اہلِ دل پہ یہ بہتاں نئے نئے

مغرب کے فیلسوفوں کے قرباں جائیے
بندر بنائے صورتِ انساں نئے نئے

گھر اپنا ایک دل میں بھی تم سے نہ بن سکا
ہاں کیا ہوا بنائے جو ایواں نئے نئے

ہو اتفاق شیخ و برہمن میں کس طرح
پیدا ہیں اختلاف کے ساماں نئے نئے

تھل بیڑا نوح کی بھی نہ کشتی کا لگ سکے
کلجگ میں اُٹھ رہے ہیں یہ طوفاں نئے نئے

چولا بدل کے کایا پلٹ ہو گئے کیسے گل
گاتی ہے راگ بلبلِ بستاں نئے نئے

جو حال تھا وہ بڑھ کے سوا ہو رہا ہے اب
لاتی ہے رنگ زلفِ پریشاں نئے نئے

لفظِ سیاسی حق کا ترقی کا قطب ہے
لوگوں کو خوب ہوتے ہیں وجداں نئے نئے

سودا ہے سر میں آنکھوں میں چھائی ہے خیرگی
ہم دیکھتے ہیں خواب پریشاں نئے نئے

صادق نہیں ہے عشق نہ الفت ہے بے غرض
دعوے نہیں یہ آپ کو شایاں نئے نئے

سودائی ہے کوئی تو کوئی مست جگی نژاد
اس گھر میں گھس کے بیٹھے ہیں مہماں نئے نئے

جلنے پڑے نفاق و حسد اس قدر بڑھے
تعلیم کے یہ ہم پہ ہیں احساں نئے نئے

انکی طرف کسی کی توجہ ذرا نہیں
کھلتے ہیں جو ترقی کے میداں نئے نئے

خالِ سیہ سے زینتِ حسنِ صبیح ہے
بت سیکھیں دلفریبی کے عنواں نئے نئے

چکر کہاں یہ جا کے ٹھہرتا ہے دیکھئے
لاتی ہے رنگ گردشِ دوراں نئے نئے

برگشتہ ہے جو زلف تو ہے پرشکن جبیں
عشاق کی ہیں جان کو خلجان نئے نئے

کوشش یہ ہو رہی ہے کہ مرد انہیں بنائیں
پیدا ہوئے ہیں حامئ نسواں نئے نئے

گانے میں لڑکے۔ لڑکیاں ورزش میں تیز ہیں
تعلیم کے ہیں کارِ نمایاں نئے نئے

زور آزمائیوں کے ہیں جوہر سٹیج پر
رستم نئے نئے ہیں نریماں نئے نئے

ان کے نکالنے کی بھی تدبیر کیجئے
دل میں جو پال رکھے ہیں ارماں نئے نئے

اہلِ زباں کا سرد ہے بازار ان دنوں
شاعر نئے نئے ہیں سخنداں نئے نئے

ٹھہرا ہے حصرِ ملت و قوم اب زبان پر
تہذیب کے یہ پھیلے ہیں ارکاں نئے نئے

یارانِ رفتہ کی کہیں اب کس سے داستاں
دنیا نئی ہے اور ہیں انساں نئے نئے

کیفی ہٹے نہ بزمِ سخن میں تو بڑھ کے بول
نقادِ فن کے بیٹھے ہیں سحباں نئے نئے

یہ ترکیب بند اُردو لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اعلیٰ تخیل اور نادر حقیقت نگاری کا کمال ہے دولت اور افلاس کے موضوع پر طومار لکھے گئے ہیں لیکن جو طرز اِس ترکیب میں اختیار کی گئی ہے اور جس خوبی سے موعظت کا کُنا یہ اِس نظم میں پا یا جاتا ہے۔ تعریف سے مستغنی ہے۔ تمام نوعِ انسان کو طلب زر کے اعتبار سے سات قسموں پر منقسم کیا ہے۔ اِن طالبوں کی عرض معروض سُننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دولت کی دیوی کے جواب ایسے ہیں۔ کہ اِن ہی سے نفس سوال اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم جناب کیفی کی اُن نظموں میں سے ہے۔ جو دُنیا کی شاعری کی ذیل میں ممتاز جگہ لینے کی مستحق ہے۔ (مدیر)

(نوٹ)

(۱) پہلا بند۔ اُس نوجوان کی طرف خطاب ہے جو ابھی سے امیر الامرا بنجانا چاہتا ہے

(۲) دوسرا بند۔ اسکی طرف ہے۔ جو بخت لپست ہمت اور کاہل الوجود ہے چاہتا ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دوست ملجائے

(۳) تیسرا بند اُس شخص کی طرف ہے جسے دولت ملی۔ اور رکھ نہ سکا۔

(۴) چوتھا بند۔ اُسکی طرف ہے جسے دولت کی پروا ہی نہیں۔ اکثر عالم۔ شاعر

اور فلسفی مالدار نہیں ہوتے۔

(۵) پانچواں بند لالچی کی طرف خطاب ہے۔ جو باوجود اہلِ دول ہونے کے مزید دولت کی طلب رکھتا ہے۔

(۶) چھٹے بند میں کنجوس آدمی کی طرف خطاب ہے۔ جو کھائے نہ کھانے دے۔

(۷) ساتویں۔ اُس حق پسند کیطرف ہے۔ جو دولت کا طالب ہے مگر اُسکو اپنا خدا نہیں بنا لیتا اور اُس کا مناسب استعمال کرتا ہے ۔

بند نمبر ۱

تو مرے واسطے اِس درجہ پریشاں کیوں ہے
دُور سے دیکھکے صُورت مری حیراں کیوں ہے

قول یہ یاد ہے کے آدمی کے پیر شدی
مرے ملنے کا ابھی سے تجھے ارماں کیوں ہے

دن کے کاموں میں لگا دل کہ سویرا ہے ابھی
استراحت کا یہ پوچھتے ہی ساماں کیوں ہے

مجھ کو سمجھا ہے مگر منہ کا نوالا کوئی ہو
اتنا بیتاب تو اے بندۂ آساں کیل ہے

جھٹ سے ہاتھ آؤنگی تو جھٹ سے سُبک جاؤنگی
رنج و محنت سے تجسس کے گریزاں کیوں ہے

ٹھنڈے دل سے تو ذرا جھیل تو یہ سوزِ فراق
برق بیتاب صفت شعلہ بداماں کیوں ہے

پہلے دامن تو وہ پیدا ہو سماؤں جس میں
جوشِ وحشت میں عبث چاکِ گریباں کیوں ہے

کام ہے ٹھیک سُہی وقت پہ جو ہوتا ہے
اپنی تعجیل مزاجی سے پریشاں کیوں ہے

امتحاں میں نہیں منظور کہ ڈالوں تجربہ کو
صبر کر دم لے ذرا اتنا ہراساں کیوں ہے

دل نوازی ہے مری درخورِ ظرفِ طالب — تو سوا اس سے مرے لطف کا خواہاں کیوں ہے

قابل اور اہل جب اے دوست تجھے پاؤنگی
بن بلائے ہی ترے پاس چلی آؤنگی

بند نمبر ۲

تو نے میرے لئے گر رنج اٹھایا ہوتا — میرے الطاف کا سر پہ ترے سایا ہوتا
سر جھکائے رہا پیشانی کی تحریر پہ تو — کبھی دریائے عرق اس پہ بہایا ہوتا
تجھ کو تدبیر سے پرہیز سی ہے گریز — دل کبھی رنج و مشقت سے لگایا ہوتا
بیشک تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے — لوحِ دل پر کبھی نقش اسکا بٹھایا ہوتا
بیگماں گوہرِ مقصود تجھے ملجاتا — غوطہ محنت کے سمندر میں لگایا ہوتا
سبز اللہ تری کشتِ تمنا ہوتی — خونِ گرم اپنا اگر اس میں کھپایا ہوتا
بن کے اکسیر ترے ہاتھ میں خود آجاتی — خاک میں آپ کو گر تو نے ملایا ہوتا
تگ و دو سے ہے گریز اس پہ یہ خواہش میں — فارغ البالی کا اونچا مری پایا ہوتا
رہا آسان طلبی صفت بری کا لپکا — ہاتھ سے کام کبھی کر کے دکھایا ہوتا
جستجو مری زخود رفتہ تجھے کر دیتی — شوق میرا جو ترے سر میں سمایا ہوتا

پاس پیاسے کے کبھی ناداں کنواں آتا ہے
گرتا پڑتا وہاں وہ آپ پہنچ جاتا ہے

بند نمبر ۳

دلِ ناداں کو ترے میری تمنا کیوں ہے
مجھ سے پھر ملنے کا سر میں ترے سودا کیوں ہے

جب ترے پاس تھی کچھ قدر نہ تُو نے میری
اب تو مُنہ دیکھنے کو میرے ترستا کیوں ہے

دھکّے دے دے کے نکالا تھا کبھی یاد تو کر
اب وظیفہ مرا دن رات تو پڑھتا کیوں ہے

ٹھوکریں مار کے جب تُو نے کیا تھا دربدر
اب مرے واسطے دردر تو بھٹکتا کیوں ہے

کیوں کیا تھا مجھے غیروں کے حوالے تُو نے
ایڑیاں اب مری خاطر تُو رگڑتا کیوں ہے

ٹھیکری سے بھی برابر نہیں سمجھا مجھ کو
راگ اب مدح و ثنا کا مری گاتا کیوں ہے

یا تو وہ تھا کہ ذرا پاس ٹھہرنے نہ دیا
بیقرار اب تو مرے واسطے اتنا کیوں ہے

کام برسوں کا تو کر بیٹھا ہے ختم اک دن میں
مجھ سے اب پہلو تہی کا تجھے شکوا کیوں ہے

پانی سمجھا تھا سمندر کا تو مگر مجھ کو تو
جستجو میں مری اب خاک اُڑاتا کیوں ہے

عزم و ہمت جو ترے پاس تو میں دور نہیں
وقت کو گریہ و زاری میں گنواتا کیوں ہے

یہ تو مشکل ہے کہ پہلے کی طرح ہو دل صاف
کر بھی دیتی ہوں میں غفلت کا کبھی جرم معاف

بند نمبر ۴

پاس تیرے نہیں ممکن مرا آنا ہرگز
میری وقعت کو نہ تُو نے کبھی جانا ہرگز

کاغذی کپڑوں کا بیٹھا ہے ترے دل پہ نقش
کارگر ہو نہ مرا رنگ جمانا ہرگز

دھن میں تو اپنی سدا مست رہا کرتا ہے
تُو ہے بیگانہ نہیں میرا لگانا ہرگز

تیری تخئیل کا میداں ہے کبھی شعر و سخن — اس سے آساں نہیں دل تیرا اُٹھانا ہرگز

تو ہے وہ شمع کہ گھر جس کا ہے فانوسِ خیال — میرا اِس نور سے تو ہو نہ زمانا ہرگز

گنجِ معنی کو ہی تو زیست کا حاصل سمجھا — تیرے ہاں ہو نہ سکے میرا ٹھکانا ہرگز

تو در و بست بنا میری ہی ہٹ کی جا گیر — تیرے گھر میں نہیں ممکن میرا آنا ہرگز

تیری نظروں میں نہیں خاک بھی عزت میری — قابلِ قدر ہوں میں تو نے نہ مانا ہرگز

باغِ دل کو ہے ترے ایک بہار او خزاں — گوشِ دل سے نہ سنا میرا ترانا ہرگز

مسئلے دور کے رہتے ہیں ترے پیشِ نظر — حال تیرا نہ بنا اس کا فسانا ہرگز

کس لئے آؤں میں - آؤں بھی ترے پاس اگر
تو وہ مدہوش ہے جس کو نہیں آپے کی خبر

بند نمبر ۵

گو مرا لطف و کرم تجھ پہ رہا کرتا ہے — ذکر کیا شکر کا اُلٹا تو گلہ کرتا ہے

میں کسی اور طرف رُخ جو ذرا کرتی ہوں — ایک کانٹا سا ترے دل میں چبھا کرتا ہے

تو نے چاہا سو ملا - تو نے جو مانگا پایا — کس لئے دھر میں ہنگامہ بپا کرتا ہے

میں ہوں موجود ترے پاس مگر اس پہ بھی — دوسروں کی مرے دن رات دعا کرتا ہے

ابرِ رحمت کی طرح گھر پہ ترے چھائی ہوں — پیچھے پیچھے مرے پھر کیوں تو پھرا کرتا ہے

یاد رکھ اس سے کھٹک جاتی ہوں میں جو مری — قدر بڑھ کر مرے منصب سے کیا کرتا ہے

شکر کر کام میں لا اس کو جو ملتا ہے تجھے — ماسوا کے لئے کیوں اتنا کھپا کرتا ہے

تیری وافر طلبی زہر ہے تیرے حق میں — دیکھ ہر ہیضے سے پرہیز مرا کرتا ہے

ﷺ یعنی سرستی کی جو علم کی دیوی ہے -

نہیں مفقود کی۔موجود کی ہے تجھکو تلاش
کیا ہے سودائی ذرا سوچ تو کیا کرتا ہے

شانتی اور قناعت نہیں طینت میں تری
جتنا ملتا ہے طلب اور سوا کرتا ہے

تجھ کو درکار ہے جو چیز وہ ہے تیرے پاس
پھر تو کیوں رہتا ہے مضطر۔تجھے کیا ہے ہوس

بند نمبر ۶

پڑ گئی ہیں تو مصیبت میں ترے پاس آکر
سنگدل ایسا ہے تو! اسکی مجھے کیا تھی خبر

جی گھٹا جاتا ہے اتنا تو نہ کر ناک میں دم
ذرا کھانے دے ہوا۔جانے دے مجھ کو باہر

سات تالوں میں یہ کیوں بند کیا ہے ظالم
میرا عاشق تو بنا تھا کہ بنا تھا جیلر

تو نے مٹی میں ملایا ہے مرا حسن و شباب
زنگ ہے چھایا ہوا آئینہ خوبی پہ

بندش آہنیں یہ طوق۔یہ زنجیریں ہیں
واہ کیا گھر ہے مرا! کیسے ہیں میرے زیور

تو نے اتنا جو ستایا ہے تو لے اسکا مزا اب
ظلم جو مجھ پہ کئے اُن کے اٹھا اب تو ثمر

یاد رکھ مجھ کو ستا کر نہ رہا کوئی سکھی
کر دل حال پہ اپنے تو ذرا ڈال نظر

عیش کیا سمجھا ہے لابد کو بھی بدِ فاضل
کیوں نہ آرام سے پرہیز ہو۔راحت سے حذر

پیٹ بھر روٹی جو ملجائے تو پھر ہیں چھوٹ
آدمیت کی نہ پوشاک کبھی ہو تن پہ

رات کی نیند اڑے دن کا ہو آرام حرام
ظلمتِ بخت سے تیرہ ہو ترا شام و سحر

میں ہوں آزاد منش مجھ کو کریگا کیا قید
بن گیا دام کا ناداں تو خود اپنے صید

بند نمبر ۵

گرچہ دل مجھ سے بصد شوق لگایا تُونے
اور فرضوں کو بھی اپنے نہ بھلایا تُونے

تُونے بیقدری سے اور دنگی مری قدر نہ کی
یوں سے دل میں ہے گھر اپنا بسایا تُونے

عشق تیرا ہے غرض اور خودی سے بالا
فرض کو سر پہ غرض کے ہے بٹھایا تُونے

ہے تری چاہ بری نفس کی تحریکوں سے
اس لئے مجھ پہ ہے رنگ اپنا جمایا تُونے

قید بھی مجھ کو کیا ہے تُو نے آزادی
کاٹ کر پر مجھے عالم میں اُڑایا تُونے

آنکھ سے مجھ کو گرایا نہ بٹھایا سر پر
میرے رُتبہ کو گھٹایا نہ بڑھایا تُونے

آگے غیروں کے کبھی لا کے مجھے بٹھلایا
اور اپنوں سے کبھی پردہ کرایا تُونے

کبھی سایہ سا مری پیچھے پھرا ہے برسوں
التجا پر بھی کبھی منہ نہ لگایا تُونے

تیرے ہاں جائے مناسب پہ ہیں عیش اور محنت
گھر کو میزانِ حقیقت ہے بنایا تُونے

اعتدال اور رہ وسط پہ قائم ترا دل
نہ کبھی حد سے قدم اپنا بڑھایا تُونے

عہد میرا ہے کہ میں تجھ سے نہ منہ موڑونگی
رشتہ اُنس جو باندھا نہ اُسے توڑونگی

غزلیات

جو محوِ محبوبیت نظارہ دہ حسن ہنگامہ کار ہوگا
جو گُل عروسِ چمن بنا ہے گلے کا بُلبل کے ہار ہوگا

بُت اُٹھ کے بھاگ جائینگے بتکدے سے پناہ لینگے حرم میں جاکر
نقاب اُٹھا کر جمال آرا اگر وہ رعنا نگار ہوگا

وہ نور جب محفل آرا تو شمع و پروانہ جل بجھینگے
رہینگے ہم تم ہی جب نہ باقی تو کون کس پر نثار ہوگا

دوئی کی حد سے جو عشق گزرا تو کچھ نہ برق نظر نے چھوڑا
شہید الفت کا سینۂ اہل دل کے اندر مزار ہوگا

جو برق بنکر تڑپ رہی ہے جو ابر بن بن کے رو رہے ہے
وہ میری ہی جبین آرزو ہے یہ میرے دل کا بخار ہوگا

جیے نہ تم شمع ساں پگھل کے بجھے نہ پروانہ وار جلکر
تو پھر محبت کی انجمن میں کہاں تمہارا شمار ہوگا

ریاض الفت ہے بیت رحمت یہاں ہے کب دخل آہ و زاری
یہاں جو ہوگا ملول و محزوں وہی فنا کا شکار ہوگا

جو آہ نکلیگی قید ہوگی برنگ بو غنچہ کے دہن میں
جو نالہ اُٹھیگا سرو آسا وہ قیدی جوئبار ہوگا

پڑیگا چھالا جو جگر میں وہ داغ لالہ کے دل کا ہوگا
بنیگی پھیلا کے آنکھ جھرنا اگر کوئی اشکبار ہوگا

ہے شرط چھپ جائے جسم و جاں تک نہ اُٹھے ذرہ ہوا تک
نہیں ہے ضبط راز جس کو وہی سزاوار ہوگا

پیا پیالہ مئے مغاں کا تو شور محشر سے بھی نہ چونکا
ہے نشۂ درد عشق ایسا کبھی نہ جسکا خمار ہوگا

لگی ہے دھن جب سے اُس صنم کی نہ سدھ رہی ہم کو تن بدن کی
یہ ہم نہ پھر ہم رہیں گے کیفی یہی جو لیل و نہار ہوگا

کیا ہوا امر کرنی ہستی اگر انسان نہ ہوا
آبرو خاک ہے قطرہ کی جو طوفاں نہ ہوا

سخت مشکل ہے کہ ہمت یہ ہوئی سہل پسند
کام ٹھہرا وہی دشوار کہ آساں نہ ہوا

خیرہ آنکھیں ہوئیں اس کثرت نظارہ سے
کس لئے نور بھی پردہ میں پنہاں نہ ہوا

پیچ عجب کیا ہے عدم سے جو ہوئی دلچسپی
درخور وسعت دل عالم امکاں نہ ہوا

کھیل سمجھا کئے عالم کے کرشموں کو ہم
دل خود رفتہ کسی بات سے حیراں نہ ہوا

ہیں مرے دل میں وہ آہیں نہ بنیں جو بجلی
آنکھ میں ہے مری وہ قطرہ کہ طوفاں نہ ہوا

حوصلہ کس کو ہے دل چیر کے دکھلاؤں کسے — وہ شرر ہی نہیں ہے جو سنگ میں پنہاں نہ ہوا

جامہ پہنے رہا پروانوں کی جانبازی کا — شعلہ فانوس کے پردہ میں بھی عریاں نہ ہوا

ہندوؤں سے تو ذرا پوچھیے کیا کہتے ہیں — غم ہے پھر آپ کو کیا میں جو مسلماں نہ ہوا

قید میں سبحہ و زنار کی پھنستا کیونکر — حلقہ در گوش رہا مرتد ایماں نہ ہوا

غم رہا ان کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں — میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

اب تو یہ حضرت ساحر کو شکایت نہ رہی
کیفی سحر تو آج غزل خواں نہ ہوا

ہم نے اس عالم فانی کو تماشا جانا — ایک نیرنگیِ آشوب تمنا جانا

دیر میں جا کے اگر جلوہ صنم کا دیکھا — اپنی تصویر کا ہم نے اسے چربا جانا

کس سیہی کا حرم میں جو وتیرہ پایا — خانہ بربادیِ دل کا اسے خاکا جانا

طور پر حضرت موسیٰ نے جو کچھ دیکھا تھا — وہ بھی اک پتلیوں کا ہم نے تماشا جانا

دل کے آئینہ میں عکس رخ زیبا اترا — جو خیال آیا اسے خواب زلیخا جانا

دل کے ہوتے جسے آئینہ کی حاجت ہوئی ہے — محو وابستگیِ لطف تماشا جانا

اصل و حادث کی بنا ہے عدم غیریت — اس کا جب رنگ جما غیر کو اپنا جانا

جس کو تم کہتے ہو موت اسے میں سمجھا ہوں وصال — دم شمشیر کو میں نے دم عیسیٰ جانا

یہ جو خواہش ہے کہ خواہش سے ملے آزادی — یہ بھی اک عشوۂ افسون تمنا جانا

تیری جو بات ہے دنیا سے نرالی کیفی
سب برا کہتے ہیں جس کو اسے اچھا جانا

غم دنیا نہیں پھر کونسا غم ہے ہم کو
فکر و اندیشۂ عقبیٰ سے بھی رم ہے ہمکو

دہن غنچہ سے پیغام وفا سنتے ہیں
غازۂ عارض صد ہست عدم ہے ہمکو

قول یہ سچ ہے کہ خود کردہ کا درماں کیا ہے
داور حشر پہ ناحق کا بھرم ہے ہم کو

اگلے لقموں میں نہیں قند مکرر کا مزا
سخت بے لطف حیات پیہم ہے ہم کو

زیست کی کشمکش اور مرگ کی قربت کا الم
آمد و رفت نفس تیغ دودم ہے ہم کو

بیٹھے بیٹھے جو کٹے پھر تگ و دو سے حاصل
ہر نفس جادۂ ہستی میں قدم ہے ہم کو

ذرہ ذرہ میں نظر آتی ہے تصویر صنم
سر بسر روکش صد دیر و حرم ہے ہم کو

حال دل لکھتے نہ لوگوں کی زباں میں چرچے
وجہ انگشت نمائی یہ قلم ہے ہم کو

آنکھ کیا ڈالئے اس گل پہ جو کمھلا جائے
کیفی دل اپنا ہی گلزار ارم ہے ہم کو

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے
ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے

اک شکل ہے تفنن طبع جمال کی
اس سے زیادہ کچھ نہیں دنیا کہیں جسے

خمیازہ ہے کرشمہ پرستی دہر کا
اہل زمانہ عالم عقبیٰ کہیں جسے

اک اشک وارسیدۂ ضبط غم فراق
موج ہوائے شوق ہے دریا کہیں جسے

با وصف ضبط راز محبت ہے آشکار
عقدہ ہے دل کا عقد ثریا کہیں جسے

برہمزن حجاب ہے خود رفتگی حسن
اک شان بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے

عکس صفائے قلب کا جوہر ہے آئینہ
وارفتۂ جمال خود آرا کہیں جسے

رم شیوہ ہے صنم تو ہے رم آشنا یہ دل
حاصل ہے ہم کو عیش مہیا کہیں جسے

خونیں کفن بہ بینت کے رکھا ہے کس لئے　　قاتل ہے وہ کہ رشک مسیحا کہیں جسے

سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں دہر کا وجود
کیفی یہ بات وہ ہے معما کہیں جسے

بیا ساقی بدہ گردش بہ محفل جام و مینا را　　بدر کن از دل رنداں غبار رنج دنیا را
چہ رنج دہر ایں بازیچۂ اطفال را ماند　　بزن یک جام و از سر پاک بر کن فکر عقبیٰ را
گرا یدگر بہ بالا خوانی ایں چرخ فرومایہ　　بیفگن در تہ تحت الثریٰ عقد ثریا را
چہ وقت خوش قدح برکش ز دست ساقی مہوش　　غم دنیا و دیں از خط ہمی نظری شدہ ما را
تصرف بر حواس خویش شرط بادہ پیمائیست　　دہد ساقی نہ ایں پیمانہ دست بادہ پیما را
سویدا میشود ہر قطرۂ خوں در تن عاشق　　چہ دانی منزلت ای چارہ گر ایں جوش سودا را
چو ذوق درد مضراب پے تار نفس آمد　　بپرہیزد کسے مریض عشق از عیسیٰ مداوا را
گرت چشم بصیرت ہست در ہر ذرہ دریابی　　تجلائے کہ سر در پائے خود افگند موسیٰ را
در آشوب تمنائی کہ آزادی از آں خواہی　　ہنوز اندر قفس داند مرغ رشتہ بر پا را
میسر شد کسے را پے سپردن در رہ الفت　　ز پا از پنجۂ مژگاں برآرد خار صحرا را
نخود چوں در زند خود را در شہوار میگردد　　کمال قطرہ افزوں میکند توقیر دریا را
جہانداریست دلداری حکومت قبضہ بر دلہا　　نہ شاید مدح را کیخسرو و اسکندر و دارا

ترا معجز بیاں گفتن سزد اے کیفی خوش گو
کہ در یک کوزہ کردی آب رکنا باد و جمنا را

جناب کیفی کی دیگر تصانیف

پریم ترنگنی اس مثنوی میں تمثیل اور استعارے کے پیرایہ میں حسن اخلاق حسن سلوک۔ روحانی ترقی اور انتہائے مقصد زندگی کے وہ عالمگیر اصول مذکور ہیں جن کا اطلاق عامہ خلائق پر ہے۔ قیمت ۶ر

راج دلاری تمثیل نگاری یا ڈرامہ نویسی کے فن میں ایجاد۔ یہ سوسائٹی ڈرامہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے نتیجہ خیزی اور سوسائٹی کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالنے میں بے نظیر ہے۔ تاثیر اور جذب کا وہ عالم ہے۔ کہ آپ ختم کئے بغیر کتاب کو ہاتھ سے نہیں رکھ سکتے۔ گورنمنٹ نے اس تصنیف پر فاضل مصنف کو اول درجہ کا انعام عطا فرمایا اور سررشتہ تعلیم نے مدارس کے لئے اسے منتخب کیا۔ قیمت ۱۰ر

مراری دادا یہ بھی ایک سوسائٹی ڈرامہ ہے۔ اس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ بچوں خاصکر لڑکیوں کے لئے کونسی تعلیم مناسب و موزوں ہے دلچسپی کا وہ عالم کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ کتاب ہر مرد و زن کے پاس ہونی چاہیئے۔ اردو میں اس قسم کا ڈرامہ اب تک نہیں لکھا گیا۔ قیمت ۸ر

تزک قیصری منظوم تاریخ ہند جس میں سلسلہ حالات ابتدا سے لیکر بادشاہ معظم جارج پنجم کے دربار دھلی تک کے واقعات نہایت دلاویز طرز پر نظم کئے گئے ہیں قیمت ۸ر

شوکت ہند اس ترکیب بند میں ہند قدیم کی شوکت کا مرقع پیش کیا گیا ہے قیمت ۲ر

المشتھر

شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور